فہرست

شذرات	اہل سیاست اور سیاسی استحکام	منظور الحسن	۲
	فرد اور اجتماع کی نجات ــــ کرنے کا اصل کام	ریحان احمد یوسفی	۵
قرآنیات	آل عمران (۳: ۳۳۔ ۳۷)	جاوید احمد غامدی	۹
معارف نبوی	شرح موطا امام مالک	ساجد حمید	۱۳
دین و دانش	قانون عبادات (۱۳)	جاوید احمد غامدی	۲۷
حالات و وقائع	مصعب اسکول سسٹم کے طلبہ کی شان دار کامیابی	نعیم احمد بلوچ	۴۵
تبصرۂ کتب	''تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیل نو''	ریحان احمد یوسفی	۴۷

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

منظور الحسن

اہل سیاست اور سیاسی استحکام

پاکستان میں جمہوری اقتدار کو غیر مستحکم کرنے کا الزام جس قدر فوج اور بیورو کریسی پر عائد کیا جاتا ہے، اسی قدر اس کے مستحق اہل سیاست بھی ہیں۔ جتنی یہ بات درست ہے کہ اگر فوج اور بیورو کریسی کے ادارے اپنے دائرۂ کار تک محدود رہتے تو ملک سیاسی خلفشار سے محفوظ رہتا، اتنی ہی یہ بات بھی صحیح ہے کہ اگر سیاست دان اپنے فرائض بخوبی انجام دیتے تو سیاسی استحکام کی منزل زیادہ مشکل نہ ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے سیاست دانوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے فرائض سے غفلت برتی ہے، بلکہ مجرمانہ افعال کا ارتکاب کیا ہے۔ گزشتہ پچاس پچپن برسوں میں انھوں نے جس طرز عمل کا مظاہرہ کیا ہے، اس کے بعد عوام کی لغت میں دھوکا اور سیاست ہم معنی الفاظ کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ لوگوں کے لیے اب اس کا تصور ہی محال ہے کہ کوئی سیاست دان ہوس اقتدار سے بالاتر ہو کر ان کی ترقی کے لیے سرگرم ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے اس جمہوریت پسند دور میں بھی بعض سادہ لوح لوگوں کی زبان پر یہ بات آجاتی ہے کہ ان جیسے سیاست دانوں کے اقتدار سے تو فوجی حکومت ہی بہتر ہے۔

اس صورت حال کا سبب درحقیقت چند سنگین غلطیاں ہیں جو ہمارے سیاست دانوں کے طرز عمل میں نمایاں طور پر پائی جاتی ہیں اور جن کی وجہ سے عوام ان سے مایوس ہو چکے ہیں۔

ان کے طرز عمل کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے حصول اقتدار کی جدوجہد کرتے ہوئے دین واخلاق، اصول و قانون اور جمہوری اقدار کی کبھی پروا نہیں کی۔ مناصب کے حصول کے لیے اگر انھیں جھوٹ بولنا پڑا ہے تو انھوں نے بولا ہے، خوشامد کرنی پڑی ہے تو کی ہے، رشوت دینی پڑی ہے تو دی ہے، وقار کو داؤ پر لگانا پڑا ہے تو لگایا ہے، یہاں تک کہ اقتدار کے قیام و دوام کے لیے اگر انھیں آمروں کے ہاتھ بھی مضبوط کرنے پڑے ہیں تو انھوں نے اس سے بھی دریغ نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی میدان میں یہ لوگ فوج اور بیورو کریسی کے اشاروں پر حرکت کرنے والے کھلونوں سے زیادہ کوئی حیثیت کبھی اختیار نہیں کر سکے۔ ہماری سیاسی تاریخ کا یہ کوئی معمولی المیہ نہیں ہے کہ جب بھی کوئی غیر جمہوری اور غیر آئینی حکمران

مسندِ اقتدار پر فائز ہوا ہے، ان اہلِ سیاست کی معتد بہ تعداد نے اپنی خدمات اسے پیش کر دی ہیں۔ ایسے موقعوں پر اگر کسی کی طرف سے کوئی مزاحمت بھی سامنے آئی ہے تو کسی اصول اور آدرش کی بنا پر نہیں، بلکہ محض مفادات اور تعصّبات ہی کی بنا پر سامنے آئی ہے۔

قائداعظم نے گورنر جنرل بننے کے بعد مسلم لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے کر جمہوری روایت کی بنا ڈالی، مگر لیاقت علی خان نے اسے توڑ کر جب وزارتِ عظمیٰ کے ساتھ مسلم لیگ کی صدارت بھی حاصل کرنا چاہی تو مسلم لیگی سیاست دانوں نے اسے خوش دلی سے قبول کیا۔ گورنر جنرل غلام محمد نے پارلیمانی روایات کے علی الرغم پارلیمنٹ کی اکثریتی جماعت کے سربراہ خواجہ ناظم الدین کو برطرف کیا تو اہلِ سیاست خاموش رہے۔ اس کے بعد گورنر جنرل نے یکے بعد دیگرے محمد علی بوگرا اور چودھری محمد علی جیسے غیر سیاسی افراد کو وزیراعظم نامزد کیا تو مسلم لیگ کے اہلِ سیاست نے اس پر احتجاج کے بجائے انھیں اپنی جماعت کی صدارت بھی پیش کر دی۔ پھر گورنر جنرل نے منتخب دستور ساز اسمبلی توڑی تو اسے بھی کچھ احتجاج کے بعد قبول کر لیا گیا۔ بعد ازاں جب گورنر جنرل سکندر مرزا کے ایما پر مسلم لیگ کے مقابلے کے لیے ری پبلکن پارٹی تشکیل دی گئی جو نہ عوامی حمایت رکھتی تھی اور نہ مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے کی اہل تھی تو مسلم لیگ کے بیش تر منتخب نمائندے اپنی جماعت چھوڑ کر اس میں شامل ہو گئے۔ اسی طرح جنرل ایوب خان، جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف نے جب غیر جمہوری طریقے سے حکومتیں قائم کیں تو انھیں بھی سیاست دانوں کے طائفے سے بے شمار لوگ میسر آ گئے۔ تاریخ کے اس جائزے سے یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ہمارے اہلِ سیاست نے محض اپنے اقتدار کے لیے ملک میں سیاسی استحکام کو داؤ پر لگائے رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر سیاست دان ہوسِ اقتدار سے بالاتر رہتے اور باہم متحد ہو کر غیر جمہوری حکمرانوں کے خلاف جدوجہد جاری رکھتے تو یہ ملک اس وقت مستحکم سیاسی اقدار کا حامل ہوتا۔

اہلِ سیاست کی دوسری غلطی یہ ہے کہ انھوں نے عوام کے ساتھ سراسر غیر سیاسی طرزِ عمل اختیار کیا۔ انھوں نے نہ عوام کے اندر اپنی جڑیں مضبوط کرنے کی طرف کبھی توجہ دی، نہ ان سے رابطے کا کوئی چینل قائم کیا اور نہ ان کی تنظیم سازی کی طرف مائل ہوئے۔ انھوں نے عوام سے اگر کچھ ربط و تعلق قائم بھی کیا تو اسے بھی انتخابی جلسے جلوسوں تک محدود رکھا۔ عوام سے مینڈیٹ لینے کے بجائے اکثر ان کی یہی کوشش رہی کہ کسی دوسرے ذریعے سے ایوانِ اقتدار میں پہنچا جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ہمیشہ عوام کی ترجیحات اور امنگوں کے برعکس معاملہ کیا۔

جب کبھی برسرِ اقتدار آئے تو عوام سے اپنا تعلق یکسر ختم کر لیا۔ یہ تجربہ اکثر لوگوں نے کیا کہ جو سیاسی لیڈر انتخابات کے دنوں میں اس کے ساتھ محبت سے ملتے تھے، اس کے دکھ درد کو سنتے تھے اور اس کی حاجت روائی کے وعدے کرتے تھے، انھوں نے کامیاب ہوتے ہی اسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ ان سیاست دانوں نے اقتدار میں آ کر اگر کچھ پروا کی تو صرف اقربا، احباب اور قریبی کارکنان کی۔ ترقی کے دروازے اگر کھولے گئے تو صرف قریبی لوگوں کے لیے اور اس ضمن میں میرٹ کا کوئی لحاظ نہ کیا گیا۔

جو سیاسی جماعتیں تشکیل دیں، انھوں نے اپنے کارکنوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے کے بجائے ارادت کے جذبات کو پروان چڑھایا۔ انھیں اس بات کی ترغیب دی کہ قائد ہی کی بات حرف آخر ہے۔ آج اگر وہ کسی بات کو غلط کہتا ہے تو وہ سراسر باطل ہے اور کل اسی بات کو صحیح کہتا ہے تو وہ عین حق ہے۔ جماعت کے اندر اسی شخص کو ترقی کے مواقع فراہم کیے جو قائد کے اشارے پر بے بہا مال و زر لٹانے کے لیے تیار ہو یا اس کی مدح سرائی میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے والا ہو۔

ملکی سطح پر تو جمہوریت کے نعرے خوب بلند کیے، مگر اپنی جماعتوں کے اندر بدترین آمریت کا مظاہرہ کیا۔ نہ کارکنوں کو اپنے قائدین منتخب کرنے کا موقع فراہم کیا، نہ نیچے سے اوپر تک مشاورت کا کوئی نظام وضع کیا اور نہ آزادی رائے کی گنجایش باقی رکھی۔ عوام کو جب بھی سڑکوں پر نکالا تو اس مقصد کے لیے نکالا کہ وہ اپنی جانوں، اپنی املاک اور اپنے وقت کی قربانی دے کر ان کے اقتدار کی راہیں ہموار کریں۔

عوام کے ساتھ اس طرز عمل کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ وہ ان سے پوری طرح مایوس ہو گئے۔ ان اہل سیاست پر نہ انھیں اعتماد رہا اور نہ کوئی تعلق خاطر وہ باقی رکھ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہم انتخابات کے موقع پر ان سیاست دانوں کے لیے عوام کی حمایت کا تجزیہ کریں تو اس کی حقیقت صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی دانست میں بڑی برائی کے مقابلے میں چھوٹی برائی کو ترجیح دے رہے ہوتے ہیں۔

ان اہل سیاست کی تیسری بڑی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے ان جمہوری اقدار کو بھی پامال کر ڈالا جو ان کی اپنی بقا کے لیے ضروری تھیں۔ وہ وعدے جن کی بنا پر انھوں نے عوام سے ووٹ لیے، برسر اقتدار آ کر ان پر عمل تو کجا، کسی کو یاد بھی نہیں رہے۔ وہ جماعتیں جن کی حمایت سے وہ ایوان حکومت میں پہنچے، ان سے اپنی وفاداری تبدیل کر لینے میں انھیں کبھی تردد نہ ہوا۔ وہ آئین اور قوانین جنھیں انھوں نے خود تخلیق کیا اور جن کی حفاظت پر وہ مامور ہوئے، ان کی خلاف ورزی کو سیاسی عمل کی ضرورت سمجھا۔ پارلیمنٹ میں اختلاف برائے اختلاف ہی کی روایت قائم کی۔ اگر حزب اختلاف کی نشستوں پر بیٹھے تو حکومت کے صحیح اقدامات کی بھی مخالفت کی اور اگر مسند حکومت پر فائز ہوئے تو حزب اختلاف کے وجود ہی کو برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔ قوم کی معاشی بدحالی کے باوجود ایسی مراعات کو اپنے لیے مختص کیا جو دنیا کی بڑی ریاستوں کے اربابِ اقتدار کو بھی حاصل نہیں ہیں۔ قومی خزانے میں مالی بدعنوانی کی ایسی داستانیں رقم کیں جنھیں سن کر راہزن بھی کانوں کو ہاتھ لگائیں۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ سیاسی جماعتیں ہوں یا مقنّنہ اور انتظامیہ کے جمہوری ادارے، سب تباہ و برباد ہو کر رہ گئے۔

یہ اس طرز عمل کی ایک جھلک ہے جو ہمارے سیاست دانوں نے گزشتہ نصف صدی میں پیش کیا ہے۔ یہ تصویر سامنے لانے سے ہمارا مقصود یہ ہرگز نہیں ہے کہ لوگ ان کے بجائے کسی اور طرف رجوع کریں، بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ اہل سیاست اس آئینے کو اپنے سامنے رکھیں اور قومی تعمیر کے لیے اپنے کردار کو نئے سرے سے ترتیب دیں۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ریحان احمد یوسفی

فرد اور اجتماع کی نجات ـــــ کرنے کا اصل کام

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کو آزمایش کی غرض سے پیدا کیا ہے۔ اس آزمایش کا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ دنیا کی آلایشوں میں رہ کر اپنے نفس کو پاک رکھنے والے لوگ کون ہیں۔ یہی پاکیزہ لوگ آخرت میں پروردگار کی ابدی جنت کا انعام پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا یہ تقاضا تھا کہ انسان کی اس آزمایش کا بڑا حصہ اس کی معاشرتی حیثیت سے متعلق ہو۔ چنانچہ انسانوں کی فطرت میں معاشرتی زندگی کا ایک بھرپور احساس ودیعت کیا گیا۔ اسی لیے انسان، جانوروں کے برعکس، اس دنیا میں تنہا نہیں، بلکہ اجتماعیت کی شکل میں زندگی گزارتے ہیں اور تاریخ کے ہر دور میں وہ کسی ایسے گروہ کی شکل ہی میں رہے ہیں جس پر معاشرے کا اطلاق کیا جا سکے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اللہ تعالیٰ نے اس اجتماعیت کی بنا خاندان کے ادارے کو قرار دیا ہے۔ حضرت آدم سے لے کر آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک اس کی ہدایت کا ایک بڑا حصہ خاندان کے استحکام سے متعلق رہا ہے۔ زنا کی حرمت کا اصل سبب یہی ہے کہ وہ خاندان کی جڑ کاٹ پھینکتا ہے۔ چنانچہ ہر شریعت زنا کی بیخ کنی کو اپنے اہداف میں شامل کرتی رہی ہے۔ آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں بھی اخلاقی اور قانونی، دونوں پہلوؤں سے ایسے احکام دیے گئے ہیں جو جبلت میں موجود حیوانی جذبوں کو بے لگام ہونے سے روکتے ہیں۔ اس پر فطرت میں موجود حیا کا جذبہ مستزاد ہے جو انسان کے سرکش جذبات کو پابند سلاسل نہ سہی پابند اقدار ضرور کر دیتا ہے۔ انسانی زندگی کا تمام تر حسن اس اجتماعیت سے عبارت ہے جو میاں بیوی کے تعلق سے جنم لینے والے خاندان پر مبنی ہے۔ جہاں ان دو کے علاوہ ہر تعلق میں اصل اساس حیا، حمیت، ہمدردی اور خیر خواہی کے وہ جذبات ہیں جو انسان کو جانوروں سے ممتاز کرتے ہیں۔ انھی احساسات کے ہونے یا نہ ہونے کی بنیاد پر انسانوں کے پرچۂ امتحان کا ایک بڑا حصہ تشکیل پاتا ہے۔

دور جدید میں الحاد پر مبنی مغربی تہذیب نے جہاں دیگر فطری تصورات پر ضرب لگائی ہے، وہاں خاندان کے اداروں کی

اساسات کو بھی زمین بوس کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ وحی کی رہنمائی کا انکار کرنے کے بعد یہ تہذیب انسان کو ایک ایسے حیوان کے روپ میں دیکھتی ہے جس نے اتفاقاً دو ٹانگوں پر چلنا سیکھ لیا ہے۔ انسانی وجود کو مادیت کی تنہا آنکھ سے دیکھنے کا یہ نقطۂ نظر طے کر دیتا ہے کہ یہ محسوس دنیا اس دو پایہ مخلوق کی تمناؤں اور حوصلوں کی تکمیل کا آخری میدان ہے۔ اس تہذیب کے باشعور عناصر اس یقین پر کھڑے ہیں کہ آج کا ارتقا یافتہ فرد معاشرے کی وہ اساس ہے جس کی آزادی اور جس کا مفاد ہر اخلاقی ضابطے کی بنیاد ہے۔ چنانچہ انفرادیت (Individualism) اور مادیت (Materialism) کی اس سوچ کے تحت قرار پاتا ہے کہ فرد کو ہر لطف، ہر نعمت، ہر ذائقہ، ہر جلوہ اور ہر لمس شیریں اسی دنیا میں حاصل کرنا ہے۔ ہر ترقی، ہر کامیابی، ہر منزل، ہر عروج اور ہر بڑائی صرف اسی دنیا میں دیکھنا ہے۔ ہر نظم، ہر پابندی، ہر ضابطہ، ہر اصول اور ہر قانون جو فرد کی آزادی اور مفاد کے خلاف ہو، باطل ہے۔ مغرب کی اشرافیہ انفرادیت کی اسی اساس پر اپنا ضابطۂ حیات ترتیب دیتی اور نظم اجتماعی چلاتی ہے اور مادیت پر مبنی یہی اہداف اپنے عوام کے سامنے رکھتی ہے۔ دنیا پرستی اور لطف و سرور کے یہ اہداف غیر شعوری طور پر فرد کے لیے خاندان کو ایک بوجھ بنا کر اس ادارے کی بنا ڈھا دیتے ہیں جو قربانی، ضبط نفس اور حیا کے اعلیٰ انسانی جذبات کی بنیاد پر کھڑا ہے۔ جہاں ہر تعلق بے غرض اور ہر محبت پاکیزہ ہوتی ہے۔ جہاں بچوں کی معصومیت اور بزرگوں کی ناتوانی ایک محفوظ حصار میں زندگی کی صبح و شام دیکھتی ہے۔

یہ مغربی اشرافیہ، میڈیا کی مہربانی سے، ہمارے عوام و خواص، دونوں کے امام بن چکے ہیں۔ چنانچہ یہی اقدار اور تصورات اب ہمارے ہاں بھی عام ہو رہے ہیں۔ ایک طرف جنسی بے راہ روی پر مبنی ان کے خیالات ہمارے نوجوانوں میں پھیل رہے ہیں تو دوسری طرف دنیا پرستی کی لہر ہمارے ہر گھر میں داخل ہو رہی ہے۔ دور دراز کے رشتوں کو نبھانے کی روایت کے بعد قریبی اعزہ کی دل داری کی ریت بھی اب مٹ رہی ہے۔ خاندان اب محض فرد اور اس کی بیوی بچوں پر مشتمل رہ گیا ہے۔ جہاں ہر شخص مال کمانے اور اسے خرچ کرنے کے نت نئے طریقے دریافت کرنے کو مقصد زندگی بنائے بیٹھا ہے۔ والدین اولاد کی تربیت سے بے پروا ہو کر صرف مال کمانے میں مگن ہیں۔ ان کی توجہ بچوں کے اچھے کپڑوں، اچھے سکول، کھانے پلانے اور سیر و تفریح تک محدود ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ ان کی غیر موجودگی میں ان کے بچے انٹرنیٹ پر کیا دیکھتے ہیں۔ کیبل پر ان کے پسندیدہ پروگرام کیا ہیں۔ ان کے دوستوں میں زیر بحث پسندیدہ موضوعات کیا ہیں۔ وہ وڈیو اور سی ڈی پر کون سی فلمیں دیکھتے ہیں۔ ان سب کے نتیجے میں ان کے بچوں کے لباس، ان کی سوچ، ان کے رویوں اور ترجیحات میں کس طرح کی تبدیلی آ رہی ہے۔ ان کے بچے حیا، ادب، تہذیب، یہاں تک کہ رشتوں کے تقدس سے بھی کیسے بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں، انھیں اس کا کچھ اندازہ نہیں۔

یہ بچے اور نوجوان لڑکے لڑکیاں جب اگلے خاندانوں کا آغاز کریں گے تو معاشرتی زندگی کا جو نمونہ سامنے آئے گا، وہ اسلامی نہیں، بلکہ مغربی ہو گا۔ اس زندگی میں اپنا مفاد اور اپنا بچاؤ ہر قدر سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ زندگی صرف مزے کرنے کا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نام ہوتی ہے۔نوجوان لڑکے لڑکیوں کا باہم دوستی کرنا عین فطرت اور اس سے رکنا فطرت سے انحراف کے مترادف ہوتا ہے۔ جہاں برٹنڈ رسل کے الفاظ میں جنس کو میاں بیوی کے تعلق سے الگ کرنا نوجوانوں کی ضرورت بن جاتا ہے۔اس پاکیزہ رشتے اور اولاد کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب شباب ڈھلنے لگتا ہے۔اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بوڑھے والدین ایک بے فائدہ بوجھ بن جاتے ہیں۔جس کے بعد زندگی کے ڈھلتے سورج کو تنہا دیکھنا ان کا مقدر ہوتا ہے۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہم نے اس راہ پر قدم رکھ دیا ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ اس سمت میں ہماری رفتار بڑھتی چلی جارہی ہے۔سوال یہ ہے کہ اس صورت حال میں ایک عام فرد کیا لائحۂ عمل اختیار کرے۔ہمارے نزدیک سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ والدین میں اس بات کا شعور پیدا کرنا ضروری ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت کو اپنا مسئلہ بنائیں۔اس تربیت کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود اپنی تربیت کا اہتمام کریں۔تربیت کی اساس قرآن کریم کو ہونا چاہیے، کیونکہ قرآن ہی ہے جو انسانوں کو زندگی کے مادی پہلو کے ساتھ اس کی روحانی اور اخلاقی اساسات سے متعارف کرتا ہے۔یہی ہے جو دلوں سے دنیا کا زنگ اتار کر آخرت کا رنگ چڑھاتا ہے۔یہ انسانوں سے جنت کا وعدہ کر کے ان اخلاقی ذمہ داریوں کا اٹھانا آسان کر دیتا ہے جو دوسری صورت میں آج کے فرد اور اگلی نسلوں کو پاؤں کی بیڑیاں محسوس ہوں گی۔یہ جہنم کی وعید دے کر ان حدود میں داخلے سے فرد کو روکتا ہے جس کے چپے چپے پر فرد کے لیے لذت اور اجتماعیت کے لیے موت کا پیغام ثبت ہے۔

قرآن کی بنیاد پر فرد کی تربیت، قرآن کی بنیاد پر اولاد کی تربیت، کرنے کا کام آج کوئی ہے تو بس یہی ہے۔یہی کام دنیا میں ہمارے معاشرے کو انتشار سے محفوظ رکھے گا۔یہی کام آخرت میں افراد کو جنت کی ابدی، بے مثل اور پر لطف بادشاہی کا حق دار بنائے گا۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آل عمران

(۸)

(گزشتہ سے پیوستہ)

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا، وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ، وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾

(یہ[۵۸] اہلِ کتاب تم سے بحث کرنا چاہتے ہیں)۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ نے آدم اور نوح، اور ابراہیم اور عمران کے خاندانوں[۵۹] کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر اُن کی رہنمائی کے لیے منتخب فرمایا[۶۰]۔ یہ ایک دوسرے کی اولاد ہیں اور (جو کچھ کہتے اور کرتے رہے ہیں، اللہ اُس سے واقف ہے، اِس لیے کہ) اللہ سمیع و علیم ہے۔ ۳۳-۳۴

[۵۸] سورہ کی تمہید یہاں ختم ہوئی۔ ان آیتوں سے اب نصاریٰ پر اتمام حجت کا مضمون شروع ہوتا ہے۔

[۵۹] ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ عمران کے خاندان کا ذکر یہاں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ عمران بن ماتان سیدہ مریم کے والد ماجد کا نام ہے۔ یہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے جد مادری ہیں۔ آگے کا مضمون چونکہ اُس دعا سے شروع ہو رہا ہے جو سیدہ مریم کی والدہ نے اُن کی پیدایش کے موقع پر کی تھی، اس لیے یہاں بھی انھیں نمایاں کر دیا ہے۔

[۶۰] اشارہ ہے نبوت و رسالت اور شہادت علی الناس کے اس منصب کی طرف جو آدم اور نوح کو اُن کی انفرادی حیثیت میں اور ذریت ابراہیم کو بحیثیت جماعت عطا کیا گیا۔ ابراہیم اور عمران کے بجائے 'آل ابراھیم' اور 'آل عمران' کے الفاظ یہاں

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ : رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا،
فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ، اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا، قَالَتْ: رَبِّ
اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ، وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی،
وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ، وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۳۶﴾

اِنھیں یاد دلاؤ وہ واقعہ جب عمران کی بیوی نے دعا کی کہ پروردگار، یہ میرے پیٹ میں جو بچہ ہے، اُس کو میں نے ہر ذمہ داری سے آزاد کر کے تیری نذر کر دیا ہے[۶۲]۔ سو تو میری طرف سے اِس کو قبول فرما۔ بے شک تو سمیع و علیم ہے۔ پھر جب اُس نے جنا تو بولی کہ پروردگار، یہ تو میں نے لڑکی جن دی ہے[۶۳] —— اور جو کچھ اُس نے جنا تھا، اللہ کو اُس کا خوب پتا تھا[۶۴] —— اور (بولی کہ) لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا[۶۵]۔ (خیر اب یہی ہے) اور میں نے اِس کا نام مریم رکھ دیا ہے اور اِس کو اور اِس کی اولاد کو میں شیطان مردود سے تیری

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اسی حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔

[۶۱] مطلب یہ ہے کہ ان بزرگوں کے علم و عمل اور ان کی دعوت کے بارے میں جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے بحث کرنا چاہتے ہیں، وہ سوچ لیں کہ کس سمیع و علیم ہستی کو وہ اپنی طرف سے کچھ بتانے کی جسارت کر رہے ہیں۔

[۶۲] بنی اسرائیل میں کسی بچے کو اللہ تعالیٰ کی نذر کرنے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اسے بیت المقدس کی خدمت کے لیے خاص کر دیا جائے گا اور اس پر کھلانے کمانے اور گھر در کی کوئی ذمہ داری نہ ہو گی۔

[۶۳] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدہ مریم کی والدہ لڑکے کی ولادت کی توقع کر رہی تھیں اور اسی توقع پر انھوں نے اسے معبد کی خدمت کے لیے وقف کر دینے کا ارادہ کیا تھا۔

[۶۴] یہ ان کی بات کے بیچ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک جملۂ معترضہ ہے۔ استاذ امام اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''والدۂ مریم کا یہ کہنا کہ 'انی وضعتها انثٰی' (میں تو یہ لڑکی جنی ہوں) نومولود سے متعلق ایک کمتری کے احساس کی غمازی کر رہا تھا اور انھیں اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنا یہ ہدیہ بہت حقیر محسوس ہو رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی غایت درجہ رافت و رحمت سے یہ واضح فرمایا کہ والدۂ مریم تو مریم کو ایک لڑکی ہونے کی بنا پر نہایت حقیر چیز سمجھ رہی تھیں، لیکن اللہ کو خوب علم تھا کہ لڑکی کی صورت میں اُن کے پیٹ سے کیسی عظیم اور بابرکت ہستی ظہور میں آئی ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۷۷)

[۶۵] یہ سیدہ کی والدہ نے اپنے تردد کا اظہار کیا ہے کہ کہاں وہ لڑکا جس کے بارے میں میں نے سوچا تھا کہ اسے اللہ

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ، وَّاَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا، وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا، كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ، وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا، قَالَ يٰمَرْيَمُ: اَنّٰى لَكِ هٰذَا، قَالَتْ: هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ

پناہ میں دیتی ہوں۔ (اُس کے احساسات یہی تھے)، تاہم اُس کے پروردگار نے اِس (لڑکی) کو بڑی خوشی کے ساتھ قبول فرمایا اور نہایت عمدہ طریقے سے پروان چڑھایا اور زکریا[66] کو اُس کا سرپرست بنا دیا۔ (چنانچہ) جب کبھی زکریا محراب[67] میں اُس کے پاس جاتا[68] تو وہاں اللہ کی عنایت دیکھتا تھا[69]۔ (اِسی طرح کے ایک موقع پر) اُس نے پوچھا: مریم، یہ کہاں سے پاتی ہو[70]؟ اُس نے جواب دیا: یہ اللہ کے پاس سے ہے[71]۔

تعالیٰ کی نذر کروں گی اور کہاں یہ لڑکی جو پیدا ہوئی ہے۔ اس تردد کی وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل میں معبد کی خدمت کے لیے لڑکیوں اور عورتوں کے لینے کا رواج نہیں تھا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

[٦٦] یہ زکریا جن کا ذکر یہاں ہوا ہے، سیدنا ہارون علیہ السلام کے خاندان سے اور سیدہ مریم کے خالو تھے۔ بنی اسرائیل میں کہانت کا جو نظام قائم کیا گیا تھا، اس کی رو سے لاوی بن یعقوب کا گھرانا مذہبی خدمات کے لیے خاص تھا۔ پھر بنی لاوی میں سے بھی مقدس میں خداوند کے آگے بخور جلانے اور پاک ترین چیزوں کی تقدیس کی خدمت سیدنا ہارون کے خاندان کے سپرد تھی۔ دوسرے بنی لاوی مقدس کے اندر نہیں جا سکتے تھے، بلکہ صحنوں اور کوٹھریوں میں کام کرتے تھے، سبت کے دن اور عیدوں کے موقع پر سوختنی قربانیاں چڑھاتے تھے اور مقدس کی نگرانی میں بنی ہارون کی مدد کرتے تھے۔ زکریا بنی ہارون کے خاندان میں سے ابیاہ کے سربراہ تھے۔ چنانچہ اپنے خاندان کی طرف سے یہی معبد کی خدمت انجام دیتے تھے۔

[٦٧] اس سے مراد وہ محراب نہیں ہے جو ہماری مسجدوں میں امام کے کھڑے ہونے کے لیے بنائی جاتی ہے۔ بیت المقدس میں جو حجرے اور گوشے عبادت گزاروں کے لیے بنائے گئے تھے، انھیں محراب کہا جاتا تھا۔ یہاں اس سے مراد وہ خاص گوشہ اور حجرہ ہے جس میں بیٹھ کر سیدہ مریم ذکر و عبادت میں مشغول ہوتی تھیں۔

[٦٨] اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں: ایک یہ کہ حضرت زکریا سیدہ کی نگہداشت اور دیکھ بھال کے لیے اکثر ان کے پاس جاتے رہتے تھے، دوسری یہ کہ سیدہ اپنا تمام وقت اسی محراب میں، ذکر و عبادت میں گزارتی تھیں۔

[٦٩] اصل میں 'وجد عندھا رزقاً' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں رزق سے مراد وہ حکمت و معرفت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی شخص کو عطا ہوتی ہے۔ قرآن نے یہ لفظ ایک سے زیادہ مقامات میں وحی و ہدایت کے لیے استعمال کیا

(اُس لڑکی پر یہ تمھارے پروردگار کا کرم تھا)۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ جس کو چاہتا ہے، بے حساب دیتا ہے۔[۷۲] ۳۵۔۳۷

ہے۔قدیم صحیفوں میں بھی یہ تعبیر اس مفہوم کے لیے اختیار کی گئی ہے۔

[۷۰] یہ محض استفہام نہیں، بلکہ اظہار تحسین کے لیے استعجاب کا جملہ ہے۔یعنی تمھارے پاس آتا ہوں تو روحانی کمالات کے جو نفحات محسوس کرتا ہوں، یہ تمھیں کہاں سے حاصل ہوتے ہیں؟

[۷۱] سیدہ مریم کا یہ جواب کم سنی کے باوجود اُن کے پختہ علم اور فہم و بصیرت پر دلالت کرتا ہے کہ انھوں نے اسے اپنے زہد و ریاضت کا کرشمہ قرار نہیں دیا، بلکہ اللہ کی عنایت اور اس کا فضل قرار دیا ہے۔

[۷۲] یہ جملہ، جیسا کہ استاذ امام نے لکھا ہے، سیدہ مریم کے جواب کا حصہ نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سیدہ کی تحسین اور اُن پر اپنے بے پایاں فضل کا اظہار ہے۔شان کلام اس سے ابا کرتی ہے کہ اسے سیدہ کے جواب کا حصہ قرار دیا جائے۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ساجد حمید

شرح موطا امام مالک

اللہ علیم و خبیر کے بابرکت نام سے، جس کی عنایتیں بے پناہ اور جس کی شفقتیں ابدی ہیں، ہم نے موطا کی شرح کے لیے قلم اٹھایا ہے۔ یہ قلم اٹھاتے وقت اللہ سے دعا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کے ساتھ موطا میں دین اور اس کے احکام کی جو تعبیر ہم تک پہنچی ہے، اسے سمجھیں اور جو حق بات ان احادیث سے سمجھ میں آئے، اسے دین کے طالبوں کے لیے بے کم و کاست بیان کریں۔ اور یہ بھی دعا ہے کہ اللہ ہمیں اس کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق دے۔ اور ہمیں اس سارے کام کے دوران میں شیطانی وسوسوں اور نفس کی اکساہٹوں سے بچائے۔

یہ شرح میں علمی دنیا میں اپنی کوتاہ قامتی کے باوجود لکھنے کی جو جسارت کر رہا ہوں، تو صرف اس سہارے کی وجہ سے، جو مجھے استاد گرامی جناب جاوید احمد صاحب غامدی کی نہایت مشفقانہ رہنمائی کی صورت میں حاصل ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس شرح کی تکمیل تک ہر ہر حدیث کی شرح ان کی نظر سے گزرے، تاکہ یہ شرح زیادہ سے زیادہ بہتر اور غلطیوں سے پاک ہو سکے۔

اس شرح سے پہلے فہم حدیث کے اصولوں پر مقدمات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، لیکن میں یہ مقدمات ان شاء اللہ اگر زندگی رہی تو اس شرح کی تکمیل کے بعد لکھوں گا۔ بنیادی اصولوں کی حد تک میرا طرز فکر وہی ہے، جو استاد گرامی نے اپنی کتاب ''میزان'' کے پہلے باب اصول و مبادی میں پوری جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

کتاب وقوت الصلٰوۃ

نماز کے اوقات

موطا میں پہلی کتاب نماز کے اوقات سے متعلق ہے۔ اس کے آٹھ ابواب ہیں۔ اس کتاب کا نام امام مالک رحمہ اللہ نے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کتاب وقوت الصلوٰۃ رکھا ہے۔ وقوت جمع کثرت ہے، مگر یہاں یہ کثرت کے مفہوم سے مجرد ہو کر محض جمع کے معنی میں استعمال ہوئی ہے۔

پہلا باب

باب وقوت الصلوٰۃ

پنج وقتہ نماز کے اوقات

اس باب میں کل بارہ روایتیں ہیں۔ چار احادیث نبوی ہیں اور باقی آثار ہیں۔

[۱] قال حدثني يحيى بن يحيى الليثى عن مالك بن أنس عن بن شهاب:

اَنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيْزِ اَخَّرَ الصَّلَاةَ يَوْمًا، فَدَخَلَ عَلَيْهِ عُرْوَةُ بْنُ الزُّبَيْرِ، فَاَخْبَرَهُ: اَنَّ الْمُغِيْرَةَ بْنَ شُعْبَةَ اَخَّرَ الصَّلَاةَ يَوْمًا ،وَهُوَ بِالْكُوْفَةِ. فَدَخَلَ عَلَيْهِ اَبُوْ مَسْعُوْدٍ الْاَنْصَارِيُّ فَقَالَ: مَا هَذَا يَا مُغِيْرَةُ ؟ اَلَيْسَ قَدْ عَلِمْتَ: اَنَّ جِبْرِيْلَ نَزَلَ فَصَلَّى فَصَلَّى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ صَلَّى فَصَلَّى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ صَلَّى فَصَلَّى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ صَلَّى فَصَلَّى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ صَلَّى فَصَلَّى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. ثُمَّ قَالَ بِهٰذَا اُمِرْتُ.

فَقَالَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ: اَعْلَمْ مَا تُحَدِّثُ بِهِ يَا عُرْوَةُ .اَوَ اِنَّ جِبْرِيْلَ هُوَ الَّذِىْ اَقَامَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقْتَ الصَّلَاةِ؟

قَالَ عُرْوَةُ: كَذٰلِكَ كَانَ بَشِيْرُ بْنُ اَبِىْ مَسْعُوْدٍ الْاَنْصَارِيُّ يُحَدِّثُ عَنْ اَبِيْهِ.

[۲] قَالَ عُرْوَةُ: وَلَقَدْ حَدَّثَتْنِيْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا زَوْجُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّي الْعَصْرَ وَالشَّمْسُ فِيْ حُجْرَتِهَا قَبْلَ اَنْ تَظْهَرَ.

[۱] ''ابن شہاب کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز نے ایک دن (عصر کی) نماز میں تاخیر کردی۔ عروہ بن زبیران کے پاس آئے اور انھوں نے بتایا کہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے ایک دن، کوفہ کے زمانۂ (اقتدار) میں نماز میں تاخیر کردی تو ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ ان کے پاس آئے اور کہا: کیوں مغیرہ یہ کیا معاملہ ہے!

پھر کہا: کیا تمھیں معلوم نہیں ہے کہ جبریل امین آئے اور انھوں نے (ظہر کی) نماز پڑھی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ پڑھی۔ پھر انھوں نے (عصر کی) نماز پڑھی اور آپ نے ان کے ساتھ پڑھی، پھر انھوں نے (مغرب کی) نماز پڑھی تو آپ نے ان کے ساتھ پڑھی۔ پھر انھوں نے (عشا کی) نماز پڑھی تو آپ نے ان کے ساتھ پڑھی۔ پھر انھوں نے (فجر کی) نماز پڑھی تو آپ نے ان کے ساتھ پڑھی۔ پھر جبریل امین نے آپ سے کہا: مجھے انھی اوقات کا حکم دیا گیا ہے۔

(یہ حدیث سن کر) عمر بن عبدالعزیز نے کہا: اے عروہ جو حدیث آپ مجھے سنانا چاہتے ہیں، وہ مجھے بتائیے۔ اور یہ بھی بتائیے آیا یہ جبریل امین تھے، جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اوقات نماز کا تعین فرمایا؟

عروہ نے (جواب میں) کہا: ہاں بشیر بن مسعود اپنے والد سے ایسے ہی بیان کرتے تھے (کہ جبریل علیہ السلام نے آکر نمازیں اس طرح تعیین وقت کے لیے پڑھائیں)۔''

[۲] ''عروہ نے یہ بھی کہا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مجھے بتایا کہ آپ عصر اس وقت پڑھا کرتے جب دھوپ ابھی میرے حجرے میں ہوتی، اس سے پہلے کہ وہ دیواروں پر چڑھتی۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دیگر متون

ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت صحاح ستہ میں سے صرف بخاری اور سنن ابی داؤد میں آئی ہے۔ابو داؤد کی روایت میں بعض تفصیلات زیادہ ہیں ۔جس کا پورا متن ہم آگے بیان کریں گے۔البتہ دوسرے الفاظ کے ساتھ یہی روایت جس میں جبریل علیہ السلام کے دو دن تک نماز پڑھانے کا ذکر ہے، وہ ابو داؤد کے علاوہ نسائی اور ترمذی میں بھی آئی ہے۔البتہ مسلم کی روایت نہایت مختصر ہے۔دو دن امامت جبریل والی روایت یوں ہے:

عن بن عباس قال قال رسول اللّٰه امنی جبریل علیه السلام عند البیت مرتین فصلی بی الظهر حین زالت الشمس و کانت قدر الشراك وصلی بی العصر حین کان ظله مثله وصلی بی یعنی المغرب حین افطر الصائم وصلی بی العشاء حین غاب الشفق وصلی بی الفجر حین حرم الطعام والشراب علی الصائم فلما کان الغد صلی بی الظهر حین کان ظله مثله وصلی بی العصر حین کان ظله مثلیه وصلی بی المغرب حین افطر الصائم وصلی بی العشاء الی ثلث اللیل وصلی بی الفجر فاسفر ثم التفت الی فقال یا محمد هذا وقت لانبیاء من قبلك والوقت ما بین هذین الوقتین . (ابو داؤد، رقم ۳۹۳)

''ابن عباس کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیت اللہ کے پاس جبریل نے میری دو دفعہ امامت کی ۔انھوں نے مجھے ظہر سورج کے تسمہ برابر ڈھلنے پر پڑھائی ۔اور عصر مثل سایہ پر پڑھائی، مغرب افطار کے وقت پر پڑھائی۔ اور عشا شفق کے غائب ہوتے ہی پڑھائی۔اور فجر اس وقت پڑھائی جب روزہ دار پر کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔تو دوسرے دن ظہر مثل سایہ پر پڑھائی اور عصر دو مثل سایہ پر اور مغرب افطار کے وقت پر، اور عشا ایک تہائی رات کو پڑھائی۔اور دوسرے دن کی صبح پڑھائی تو روشنی ہو چکی تھی۔پھر جبریل میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا: اے محمد یہ آپ سے پہلے انبیا کا وقت رہا ہے۔اور آپ کے لیے بھی انھی دونوں کے درمیان کا وقت ہے۔''

اس روایت میں مضمون زیادہ واضح اور صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔موطا کی روایت ہی کے مانند الفاظ پر مبنی ایک روایت سنن ابی داؤد میں وارد ہوئی ہے۔اس میں اوقات الگ سے ابو مسعود رضی اللہ عنہ کے مشاہدہ کے طور پر بیان ہوئے ہیں۔باقی قصہ وہی عمر بن عبد العزیز کی نماز میں تاخیر ہی کا زیر بحث ہے:

عن ابن شهاب ان عمر بن عبد العزیز

''ابن شہاب سے روایت ہے کہ عمر بن عبد العزیز منبر پر

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

كان قاعدا على المنبر فأخر العصر شيئا فقال له عروة بن الزبير: أما ان جبريل عليه السلام قد اخبر محمدا صلى اللّٰه عليه وسلم بوقت الصلاة .فقال له عمر: اعلَم ما تقول فقال عروة: سمعت بشير بن ابى مسعود يقول سمعت ابا مسعود الانصارى يقول سمعت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقول: نزل جبريل عليه السلام فاخبرنى بوقت الصلاة فصليت معه ثم صليت معه ثم صليت معه ثم صليت معه ثم صليت معه يحسب باصابعه خمس صلوات فرايت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم صلى الظهر حين تزول الشمس وربما اخرها حين يشتد الحر ورايته يصلى العصر والشمس مرتفعة بيضاء قبل ان تدخلها الصفرة فينصرف الرجل من الصلاة فياتى ذا الحليفة قبل غروب الشمس ويصلى المغرب حين تسقط الشمس ويصلى العشاء ''حين يسود الافق وربما اخرها حتى يجتمع الناس وصلى الصبح مرة بغلس ثم صلى مرة اخرى فاسفر بها ثم كانت صلاته بعد ذلك التغليس حتى مات ولم يعد الى ان يسفر ... وعن جابر قال ثم جاء ه للمغرب حين غابت

بیٹھے (تقریر کر رہے) تھے کہ انھوں نے عصر کی نماز میں کچھ تاخیر کر دی، تو عروہ بن زبیر نے ان سے کہا: سنیے، جبریل علیہ السلام نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کا وقت سکھایا تھا۔ عمر بن عبد العزیز نے ان سے کہا، جو آپ کہنا چاہتے ہیں مجھے بتائیے۔ تو عروہ نے کہا میں نے بشیر بن ابی مسعود کو یہ کہتے سنا ہے کہ ان کے والد ابو مسعود یہ بتاتے تھے کہ آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ جبریل زمین پر آئے، مجھے نماز کے اوقات سکھائے، چنانچہ میں نے ان کے ساتھ ایک (تیسری) نماز پڑھی، پھر (چوتھی) نماز پڑھی، پھر (پانچویں) نماز پڑھی، آپ فرما رہے تھے اور انگلیوں پر پانچ نمازیں شمار کر رہے تھے۔ پھر یہ کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ ظہر اس وقت پڑھتے جب سورج نصف النہار سے جھکتا، اور جب کبھی گرمی زیادہ ہوتی تو اسے تھوڑا مؤخر کر دیتے۔ اور میں نے آپ کو عصر اس وقت پڑھتے دیکھا ہے، جبکہ سورج ابھی اونچا ہوتا اور اس کی روشنی سفید ہوتی، یعنی زردی آنے سے پہلے۔ چنانچہ ایک آدمی عصر کی نماز سے واپس جاتا اور سورج ڈوبنے سے پہلے ذوالحلیفہ پہنچ جاتا۔ آپ مغرب سورج کی ٹکیا کے منظر سے ہٹتے ہی پڑھ لیتے۔ عشا اس وقت پڑھتے جب افق سیاہ ہو جائے۔ کبھی اسے تاخیر سے پڑھتے تاکہ سب لوگ اکٹھے ہو جائیں۔ صبح کی نماز ایک دفعہ آپ نے اس وقت پڑھی جب ابھی تاریکی تھی۔ پھر دوسری دفعہ اس وقت جب اجالا ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے بعد آپ صبح کی نماز ہمیشہ اپنی وفات تک منہ اندھیرے پڑھتے رہے پھر کبھی اجالا کر کے فجر نہیں پڑھی... حضرت

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

الشمس یعنی من الغد وقتا واحدا . (ابوداؤد، رقم ۳۹۴)

جابر کہتے ہیں کہ پھر حضرت جبریل اگلے دن بھی مغرب کے لیے اسی وقت آئے جب سورج غروب ہوا۔''

شرح

قرآن وسنت سے تعلق

قرآن مجید کا فرمان ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا.(النساء۴:۱۰۳)

''بلاشبہ، نماز مسلمانوں پر وقت کی پابندی کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔''

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز ذکر کثیر کی طرح جب چاہیں کے اصول پر فرض نہیں کی گئی ہے، بلکہ اس کے اوقات متعین ہیں۔اس لیے شریعت اسلامی میں اوقات نماز کا یہ موضوع ہمیشہ موجود رہا ہے۔زیر بحث روایت اوقات نماز سے تعلق رکھتی ہے۔نماز کے اوقات سنت متواترہ کی صورت میں چلے آتے ہیں۔سنتِ متواترہ کے تحت ان کے اوقات جو ہم تک تواتر سے پہنچے ہیں،ان کے بارے میں استاذگرامی جاوید احمد صاحب غامدی لکھتے ہیں:

''نماز مسلمانوں پر شب وروز میں پانچ وقت فرض کی گئی ہے۔یہ اوقات درج ذیل ہیں:

فجر،ظہر،عصر،مغرب اور عشا۔

صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے الگ ہوجائے تو یہ فجر ہے۔

ظہر سورج کے نصف النہار سے ڈھلنے کا وقت ہے۔

سورج مرأی العین سے نیچے آجائے تو یہ عصر ہے۔

سورج کے غروب ہوجانے کا وقت مغرب ہے۔

شفق کی سرخی ختم ہوجائے تو یہ عشا ہے۔

فجر کا وقت طلوع آفتاب تک؛ظہر کا عصر،عصر کا مغرب،مغرب کا عشا اور عشا کا وقت آدھی رات تک ہے۔سورج کے زمانۂ پرستش میں طلوع وغروب کے وقت اس کی عبادت کے باعث یہ دونوں وقت نماز کے لیے ممنوع قرار دیے گئے ہیں۔

نماز کے اعمال واذکار کی طرح اس کے یہ اوقات بھی اجماع اور تواتر عملی سے ثابت ہیں۔''

(قانون عبادات،اشراق ۲۳،شمارہ دسمبر ۲۰۰۳)

فجر سے عشا تک نمازوں کے یہ نام دراصل ان کے اوقات کے نام ہیں۔نمازوں کو ان اوقات سے موسوم کرنے میں ان کا وقت بتانا ہی پیش نظر تھا۔اور سنت نے ان کا یہ نام رکھ کر ان کے اوقات کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔اب ان کی تلاش

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

کے لیے کسی چیز کی اصلاً ضرورت نہیں ہے۔ عرب جس وقت کو عصر کہتے تھے، وہی وقت عصر کا ہے اور جس کو ظہر کہتے تھے، اسی میں ظہر پڑھی جائے گی۔

قرآن مجید نے اس سنت کا ذکر کیا، اور اسے اپنے الفاظ میں جا بجا بیان کیا ہے۔ مثلاً سورۂ بنی اسرائیل کی آیت میں یہ پانچوں وقت بالصراحت بیان ہو گئے ہیں:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ، اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا. وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا .
(بنی اسرائیل ۱۷: ۷۸-۷۹)

''سورج کے ڈھلنے پر رات کے چھانے تک نماز کا اہتمام کرو۔ اور بالخصوص فجر کی قرأت کا، اس لیے کہ فجر کی قرأت روبرو ہوتی ہے۔ اور رات میں بھی کچھ دیر کے لیے اٹھو، (اور تہجد پڑھو) یہ تمھارے لیے اضافی ہے۔ اس توقع کے ساتھ کہ تمھارا رب تمھیں، (قیامت کے دن) اس طرح اٹھائے کہ تم ممدوح خلائق ہو۔''

یعنی اس آیت میں 'دلوک' پر نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور 'دلوک' وہی ہیں جن کو ہم ظہر، عصر، مغرب اور عشا کے ناموں سے اوپر بیان کر آئے ہیں۔ عشا کو اگر دلوک نہ بھی مانیں تو اس کا وقت 'غسق اللیل' کے الفاظ میں بیان ہو گیا ہے۔ فجر کا وقت بھی اس میں بتا دیا گیا ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اضافی نماز تہجد کا وقت بھی۔

اس روایت میں انھی اوقات میں سے افضل اوقات کا تعین کیا گیا ہے۔ کسی چیز کی فضیلت یا شارع براہ راست بیان کرتا ہے یا پھر وہ شارع کے بیان کردہ کسی اصول یا عقلی مسلمہ سے پھوٹتی ہے۔ یہاں حضرت جبریل نے نمازوں کے افضل اوقات بتائے ہیں۔ جیسا کہ انھوں نے بتایا کہ یہ انبیا کے پسندیدہ اوقات نماز ہیں۔ اوقات کی یہ فضیلت جیسا کہ تعجیل کے اصول سے واضح ہے، قرآن مجید کے اس اصول: 'یسارعون فی الخیرات' کہ 'وہ نیکی میں سبقت کرنے والے ہیں' (آل عمران ۳: ۱۱۴)، کی روشنی میں بنی ہے۔ سبقت کا یہ جذبہ امتثال امر کو ان کے اول وقت میں کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ یعنی جب ہمارے رب کا حکم آ گیا کہ اب ظہر پڑھنی ہے تو بلا وجہ تاخیر کیوں کر ہو، چنانچہ انبیا علیہم السلام نے اسی اصول (تعجیل) کو نمازوں میں اپنایا اور اسی کی تلقین جبریل امین نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کی۔

نماز چونکہ ایک اجتماعی عمل بھی ہے، اس لیے یہاں مصالح کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اس اصول کو قرآن مجید نے بھی جگہ جگہ بیان کیا ہے کہ 'یرید بکم الیسر و لا یرید بکم العسر' (البقرہ ۲: ۱۸۵)۔ یعنی اللہ تمھارے ساتھ آسانی چاہتا ہے مشکل نہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ 'یسروا و لا تعسروا' (بخاری، رقم ۶۹) یعنی لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرو مشکل نہ پیدا کرو۔ اس اصول پر جماعت کے وقت کا تعین ایسے کرنا ہوگا کہ جو لوگوں کے لیے تنگی

اور حرج کا باعث نہ ہو۔ جیسا کہ اگلی روایتوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے یہی معلوم ہو گا کہ آپ نے جماعت کے اوقات میں دونوں چیزوں (سبقت الی الخیر اور عوام کی سہولت) کو نبھایا۔

مفہوم و مدعا

یہ حدیث عمر بن عبد العزیز کی عصر میں تاخیر پر عروہ کے احتجاج کرنے کے واقعہ سے شروع ہوتی ہے، جسے ابن شہاب زہری نے آنکھوں دیکھے واقعے کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔ یہ واقعہ یوں پیش آیا کہ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے نماز عصر افضل وقت سے مؤخر کر دی، جس پر عروہ نے احتجاج کرتے ہوئے مغیرہ اور ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہما کے مابین ہونے والے واقعے کی تفصیلات بتائیں۔ اسی ضمن میں انھیں ابو مسعود کی زبانی وہ حدیث سنائی جس میں جبریل امین کی امامت کا ذکر ہے۔

اس حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ اور ان اوقات کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، جن میں جبریل امین نے یہ نماز پڑھائی۔ سنن ابی داؤد کی روایت میں ان اوقات کا ذکر کیا گیا ہے:

ظہر

پہلے دن جبریل علیہ السلام نے ظہر اس وقت پڑھائی، جب سورج نصف النہار سے تسمہ برابر نیچے آیا۔ دوسرے دن انھوں نے ظہر اس وقت پڑھائی جب ان کا سایہ ان کے برابر تھا۔

عصر

پہلے دن انھوں نے عصر اس وقت پڑھائی جب ان کے سائے کی لمبائی ابھی ان کے قد کے برابر تھی۔ دوسرے دن عصر انھوں نے اس وقت پڑھائی جب ان کا سایہ ان سے دوگنا تھا۔ عصر کی نماز کے حوالے سے عروہ نے سیدہ عائشہ کا ایک قول بھی نقل کیا ہے۔ آپ عصر اس وقت ادا کرتے جب ابھی دھوپ ان کے صحن میں فرش پر بھی ہوتی۔

اس جملے سے عروہ نے جلدی عصر پڑھنے پر استدلال کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک دیواروں کی صحیح اونچائی اور صحن کی وسعت کا اندازہ نہ ہو، اس وقت تک اس سے یہ مفہوم نکالنا صحیح نہ ہو گا کہ یہ جلدی ہے یا تاخیر۔ اس لیے کہ دیوار اگر چھوٹی ہو تو گھر کی مشرقی دیوار پر اس کا سایہ کافی دیر تک نہیں چڑھ سکے گا۔ البتہ اتنی بات ضرور نکلتی ہے کہ سورج ابھی سفید روشن ہوتا، جب آپ عصر پڑھا کرتے۔ لیکن دو مثل سایہ پر بھی سورج سفید روشن ہوتا ہے۔

مغرب

پہلے دن انھوں نے مغرب اس وقت پڑھائی جب روزہ کھولنے والا روزہ کھولتا ہے۔ دوسرے دن بھی مغرب انھوں نے اسی وقت پڑھائی جب روزہ دار روزہ کھولتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

عشا

پہلے دن عشا انھوں نے اس وقت پڑھائی جب شفق جا تا رہا۔ دوسرے دن انھوں نے عشا ایک تہائی رات گزر جانے پر پڑھائی۔

فجر

پہلے دن فجر اس وقت پڑھائی جب روزہ دار پر کھانا پینا ممنوع ہو جاتا ہے۔ دوسرے دن فجر اس وقت پڑھائی جب ابھی اجالا تھا۔ (ابوداؤد، رقم ۳۹۳)

یہ حدیث اوقات بتانے کے لیے نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ نماز کے سبقت الی الخیر والے اوقات کا تعین کر دیا جائے۔ یہ وہ اوقات ہیں جو انبیا کے منتخب اوقات ہیں۔ ان میں نماز پڑھنے والے نے اپنے ایسے اوقات میں نماز پڑھی ہے کہ جس کے بعد وہ تساہل اور سستی وغیرہ کے الزام سے بچ جاتا ہے۔ استاد گرامی اس روایت کے اسی محل کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''... اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نماز بغیر کسی عذر کے بالکل آخری وقت تک موخر کر دی جائے۔ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ جبریل امین نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو دن نماز پڑھائی اور فرمایا کہ انبیا علیہم السلام کی نماز کا وقت انھی دو وقتوں کے درمیان میں ہے تو فجر کو اسفار سے، عشا کو ایک تہائی رات سے، مغرب کو روزہ کھولنے کے وقت سے، اور ظہر وعصر کو اس سے زیادہ موخر نہیں کیا کہ کسی شخص کا سایہ نماز ظہر کے وقت اس کے برابر اور عصر کے وقت اس سے دو گنا ہو جائے۔''
>
> (قانونِ عبادات، اشراق ۲۵، شمارہ دسمبر ۲۰۰۳)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہماری یہ رائے کہ یہ انبیا کے پسندیدہ اوقات ہیں روایت کے اندر موجود چند قرائن کی وجہ سے بنی ہے۔

ایک یہ کہ موطا کے الفاظ: 'فقال: أمرت بهذا' کے بجائے دوسری روایتوں کے یہ الفاظ کہ 'فقال: يا محمد هذا وقت لانبياء من قبلك والوقت ما بين هذين الوقتين'، یعنی جبریل علیہ السلام نے کہا: اے محمد آپ سے پہلے انبیا کا یہی وقت رہا ہے۔ اور انھی دونوں کے مابین آپ کے لیے نمازوں کے اوقات ہیں۔ مراد یہ ہے کہ انبیا نے نماز کی اہمیت کے پیش نظر سبقت الی الخیر کے جذبے کے تحت جن اوقات میں پڑھی ہے، وہ اوقات یہی رہے ہیں اور یہی اوقات آپ کو ملحوظ رکھنے ہوں گے۔

دوسرے یہ کہ بعض روایتوں کے مطابق جس نے عصر کی ایک رکعت سورج ڈوبنے سے پہلے پا لی، اس نے عصر کی نماز پالی۔ اس سے معلوم ہوا کہ عصر کا آخری وقت غروب آفتاب ہے۔ جبکہ حدیث جبریل میں اس کا آخری وقت دومثل سایہ بیان ہوا ہے۔ دونوں کو اگر جمع کریں تو یہی تاویل بہتر ہے کہ حدیث جبریل دراصل ان اوقات کا تعین کر رہی ہے جن میں نماز پڑھنا اس کے اعلیٰ اوقات میں پڑھنا ہے۔ یعنی ان اوقات میں نماز پڑھنے والا سستی اور کاہلی کے الزام سے بچ جائے گا۔

تیسرے یہ کہ سنت ثابتہ کے ساتھ اس حدیث کی مطابقت اسی صورت میں ہوتی ہے کہ جب ہم انھیں پسندیدہ اوقات کی تعیین کے معنی میں لیں۔ ورنہ ان کا تعین بلا وجہ ہے، بالخصوص عصر کے وقت کا تعین۔

چوتھے یہ کہ عروہ کا عمر بن عبدالعزیز کے ساتھ اور ابومسعود کا مغیرہ کے ساتھ نماز کی تاخیر کا جو قصہ اس روایت میں بیان ہوا ہے، اس میں ان کا احتجاج اس بات پر ہے کہ آپ نے نماز مؤخر کر دی ہے، نہ کہ اس بات پر کہ آپ نے نماز قضا کر دی ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ ابومسعود رضی اللہ عنہ نے اس روایت کو افضل اوقات کے تعین ہی کے معنی میں لیا ہے۔ اور پھر عروہ نے اسے اسی محل میں عمر بن عبدالعزیز کے سامنے تاخیر ہی پر احتجاج کرتے ہوئے مغیرہ کا قصہ سنایا ہے۔

اس لیے ہمارے نزدیک یہ حدیث جبریل انبیا کے معمول بہ اوقات سے آگاہ کرتی ہے نہ کہ نمازوں کے اوقات سے۔ یہی وجہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سائل کو جب یہ اوقات بتائے تو اوقات تبدیل کر دیے۔ اس لیے کہ اب آپ دراصل اس شخص کو نماز کے پسندیدہ نہیں، بلکہ متعین اوقات بتا رہے تھے:

عن ابن عمرو بن العاص رضی اللّٰہ عنہ سئل رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن وقت الصلوات فقال وقت صلوة الفجر ما لم یطلع قرن الشمس الاول ووقت صلوة الظھر اذا زالت الشمس عن بطن السماء ما لم یحضر العصر ووقت صلاۃ العصر ما لم تصفر الشمس ویسقط قرنھا الاول ووقت صلاۃ المغرب اذا غابت الشمس ما لم یسقط الشفق ووقت صلاۃ العشاء الی نصف اللیل. (مسلم، رقم ۶۱۲)

''ابن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نمازوں کے اوقات کے بارے میں پوچھا گیا، تو آپ نے فرمایا کہ فجر کا وقت اس وقت تک ہے جب تک سورج کا ایک کنارہ طلوع نہ ہو جائے۔ ظہر سورج کے وسط آسمان سے جھک جانے سے عصر تک ہے۔ اور عصر کا وقت سورج کے زرد ہونے تک ہے، جب اس کا ایک کنارہ غروب ہو جائے۔ مغرب کا وقت سورج ڈوبنے سے شروع ہو کر شفق کے خاتمہ تک ہے۔ اور عشا آدھی رات تک ہے۔''

یہاں حدیث جبریل اور حدیث بریدہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ صرف دونوں کے پس منظر میں فرق ہے، ایک میں اوقات نماز کی حد بندی کی جا رہی ہے اور دوسری میں انبیا کے پسندیدہ اوقات بتائے جا رہے ہیں۔

اس روایت کے دو حصے ہیں۔ 'قال عروۃ: ولقد حدثتنی ' سے الگ روایت ہے، اس لیے بعض نسخوں میں انھیں دو روایتیں قرار دیا گیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ پہلی روایت کا ہی حصہ ہے، اس لیے کہ اس کی سند بیان نہیں ہوئی۔ یعنی عروہ نے مغیرہ بن شعبہ ہی کو دونوں باتیں بتائیں حضرت عائشہ والی بھی اور جبریل والی بھی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس میں جو واقعہ مذکور ہوا ہے۔ اس میں ایک حیرت انگیز بات یہ موجود ہے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے لیے یہ بات اجنبی تھی کہ جبریل نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امامت کرائی ہے۔ اس سے یہ واقعہ کمزور سا معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ عمر بن عبدالعزیز بذات خود دین کے ایک اچھے جاننے والے تھے۔ یہ بات تو کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے یہ حدیث نہ سنی ہو۔ مگر یہ بات مشکل ہے کہ انھیں اس کی بھی خبر نہ ہو کہ جبریل علیہ السلام نے ایسا کیا تھا۔ عروہ سے ان کا یہ سوال کہ کیا جبریل نے آپ کے لیے اوقات مقرر کیے تھے، حیرت انگیز ہے۔ اس واقعہ کی کمزوری پر رجال حدیث کے تحت گفتگو ہوگی۔ یہاں یہ واضح رہے کہ امامت جبریل کے واقعہ کی کمزوری یہاں زیر بحث نہیں ہے، بلکہ عمر بن عبدالعزیز اور عروہ کے مابین ہونے والے واقعے کی کمزوری پر یہ سوال دلالت کر رہا ہے۔

ہمارے فقہا کے مابین اصلاً صرف عصر کے وقت میں اختلاف ہے۔ ہمارے خیال میں یہ اختلاف ان انبیا کے پسندیدہ اوقات کو بیان کرنے والی روایتوں اور وقت بیان کرنے والی روایتوں کو الگ نہ کرنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ اسی طرح اس اختلاف کا سبب یہ بھی بنا ہے کہ نمازوں کے نام جنھیں تواتر حاصل ہے کو بھی پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ یعنی عصر کا لفظ اصل میں صرف نماز کا نام ہی نہیں ہے، بلکہ اس کا وقت بھی بتا رہا ہے۔ ہماری مراد یہ ہے کہ عصر سے مراد دن کا آخری حصہ ہے اور بس یہی وقت عصر ہے۔ اس کی وضاحت جب طلب کی گئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعیین بھی کر دی۔

سورج کے بلند ہونے اور سفید ہونے کے بیان سے یہ غلط تاثر نہیں لینا چاہیے کہ وہ بہت بلند تھا۔ یہاں اصل میں غروب ہونے کے متضاد اور زرد ہونے کے الٹ مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے یہ معنی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے خط سے واضح ہوتے ہیں، ان کے الفاظ تھے:

والعصر، والشمس مرتفعة بیضاء نقیة قدر ما یسیر الراکب فرسخین او ثلاثة قبل غروب الشمس. (موطا، رقم ۵)

''عصر اس وقت پڑھو، جب سورج ابھی روشن بلند اور صاف ہو، اتنا کہ ایک سوار دو یا تین فرسخ کا فاصلہ سورج ڈوبنے سے پہلے طے کر لے۔''

سوار تین فرسخ کا فاصلہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آرام سے طے کر لیتا ہے۔

لغوی مسائل

اس حدیث میں ایک ہی لسانی مشکل ہے اور وہ سیدہ عائشہ کے اس جملے 'قبل ان تظہر' میں ہے۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم عصر سورج کے ''ظہور کرنے'' سے پہلے پڑھتے تھے۔ ظہور کرنے کے معنی میں بہت اختلاف ہے کہ اس کے معنی چڑھنے اور ظاہر ہونے کے ہیں یا زوال کے ہیں۔ اسی طرح چڑھنے سے مراد کیا ہے۔ دیواروں پر چڑھنا ہے یا دیواروں سے اٹھ جانا

ہے۔

جیسے زرقانی نے لکھا ہے:

قال عياض المراد تظهر على الجدر و قيل ترتفع كلها عن الحجرة و قيل تظهر بمعنى تزول عنها... و فى رواية ابن عيينة عن ابن شهاب فى الصحيين كا ن يصلي صلاة العصر والشمس طالعة فى حجرتى لم يظهر الفئ و فى رواية مالك جعله للشمس و جمع الحافظ بأن كلا من الظهور غير الآخر فظهور الشمس خروجها من الحجرة و ظهور الفئ انبساطه فى الحجرة فى الموضع الذى كانت الشمس فيه بعد خروجها.

(شرح الزرقانی علی موطا ۱:۱۶)

''قاضی عیاض نے کہا ہے اس کے معنی دھوپ کے دیواروں پر چڑھنے کے ہیں، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد دھوپ کا حجرے سے جاتے رہنا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ 'تظہر' سے مراد زوال پانا یا زائل ہونا ہے۔... ابن شہاب سے ابن عیینہ کی روایت میں جو صحیحین میں ہے، میں یہ بات یوں ہے کہ آپ عصر اس وقت پڑھتے، جبکہ سورج میرے حجرے میں روشن ہوتا، اور اس کا سایہ بلند نہ ہوا ہوتا۔ جب کہ مالک کی روایت میں 'ظہر' کا فعل 'الشّمس' کے لیے آیا ہے، البتہ حافظ ابن حجر نے اسے جمع کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک ہر دو کا ظہور دوسرے سے مختلف ہے۔ چنانچہ دھوپ کا ظہور حجرے سے نکلنا ہے اور سایے کے ظہور سے مراد دھوپ کے بعد حجرے میں اس کا اسی جگہ پھیلنا ہے جہاں دھوپ تھی۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اشفاق الرحمٰن کاندھلوی صاحب نے 'تظہر' کا فاعل سیدہ عائشہ کو بنایا ہے۔ اور یہ کہا ہے:

والضمير إلى عائشة عبرت عن نفسها بغائب قبل ان تظهراى ترتفع.

''تظہر کی ضمیر سیدہ عائشہ کی طرف راجع ہے، انھوں نے اپنے آپ کو غائب کے صیغے میں تعبیر کیا ہے، اس سے پہلے کہ آپ اٹھتیں، یعنی آپ اٹھ آتیں۔''

ہمارے خیال میں 'الشّمس' سے مراد دھوپ ہے، اور دھوپ کا چڑھنا، ایک مظہر کا بیان ہے۔ یعنی اگر آپ عصر کے وقت صحن میں بیٹھے ہوں تو دیواروں کا سایہ لمبا ہوتا جائے گا اور سورج کے سامنے والی (مشرقی) دیوار پر آپ کو ایک وقت یہ نظر آئے گا کہ صحن میں چھاؤں ہو گی اور دھوپ صرف اس دیوار پر رہ جائے گی۔ جس سے ایسے لگے گا کہ دھوپ چلتے چلتے فرش سے دیوار پر چڑھ گئی ہے۔ اسی مظہر کو سیدہ عائشہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے، اس سے پہلے کہ دیواروں پر دھوپ چڑھ جائے۔ یہ مجاز کا اسلوب ہے۔ یعنی دھوپ پہلے ہی دیوار پر چڑھی ہوئی تھی۔ اب صرف دیوار پر باقی رہ گئی۔ جس سے لگا کہ گویا دھوپ فرش چھوڑ کر دیوار پر چڑھ گئی ہو۔ زرقانی کے اوپر کے اقتباس میں 'لم یظهر الفیء' کے جو الفاظ آئے ہیں، ان کا بھی

یہی مطلب ہے کہ سایہ ابھی دیوار پر نہیں چڑھا ہوتا تھا، فرش پر ہی ہوتا تھا۔

رجال حدیث

اس روایت کی سند اور روایت کے کرداروں میں درج ذیل لوگوں کو فہم حدیث کے لیے جاننا ضروری ہے:

اس روایت کی سند میں یحی بن یحی کا نام امام مالک سے اس لیے پہلے ہے کہ موطا کا یہ نسخہ جس کی شرح ہم لکھ رہے ہیں، یہ امام مالک کے تلمیذ رشید یحی اللیثی کا مدون کردہ ہے۔ یہ موطا کے چودہ نسخوں میں سے سب سے زیادہ متداول ہے۔ 'قال حدثنی' میں 'قال' کے فاعل انھی یحی کے بیٹے عبیداللہ ہیں۔ جنھوں نے اپنے باپ سے موطا کے اس نسخے کی روایت کی۔

ابن شہاب کا فن حدیث میں بہت بڑا مقام ہے مگر تدلیس اور شیعہ طرف داری کا الزام بھی ان پر لگایا گیا ہے۔ یہ ایلہ کے رہنے والے تھے، جمع حدیث کے سلسلے میں مدینہ اور کوفہ وغیرہ کا سفر بھی کیا۔ جمع حدیث انھوں اور دوسرے لوگوں نے عمر بن عبدالعزیز کے حکم، جو انھوں نے والی مدینہ کو دیا کے بعد ہی کی۔ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں:

واول من دون الحدیث بن شهاب الزهری علی راس المائة بامر عمر بن عبد العزیز ثم کثر التدوین ثم التصنیف وحصل بذلك خیر کثیر فللّٰه الحمد. (فتح الباری ۱:۲۰۸)

''سب سے پہلے ابن شہاب زہری نے پہلی صدی کے آغاز پر عمر بن عبدالعزیز کے جمع حدیث کے حکم دینے پر تدوین حدیث کا کام کیا۔ بعد میں پھر تدوین کا کام عام ہو گیا، پھر حدیث کی تصنیف کا کام شروع ہوا اور اللہ کا شکر ہے اس سے خیر کثیر اکٹھا ہوا۔''

اس اعتبار سے عروہ اور عمر بن عبدالعزیز کی گفتگو کے گواہ ہونے کا امکان کم ہے۔ جبکہ انھوں نے واقعہ یوں سنایا ہے کہ جیسے وہ اس گفتگو کو براہ راست سن رہے تھے اور اس سارے واقعہ کے عینی شاہد تھے۔ محدثین یہ بھی کہتے ہیں کہ عروہ سے لقا و سماع ہی ثابت نہیں ہے:

... لا یثبت له السماع من عروة وان کان قد سمع ممن هو اکبر منه غیر ان اهل الحدیث قد اتفقوا علی ذلك واتفاقهم علی الشیء یکون حجة. (تہذیب التہذیب ۹:۳۹۸)

''عروہ سے زہری کا سماع روایت ثابت نہیں ہے اگرچہ زہری نے عروہ سے عمر میں بڑے لوگوں سے بھی حدیث کا سماع کیا ہے، مگر عروہ وغیرہ سے ان کی روایت کے قبول کرنے پر محدثین کا اتفاق ہے، ان کا کسی بات پر اتفاق دلیل و حجت ہے''۔

اس لیے میرے خیال میں یہ روایت زہری کی مرسلات میں سے ہے۔ بخاری میں بھی یہ روایت ایسے ہی آئی ہے، اور

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

محدثین کا یہی اتفاق جس کا ذکر ابن حجر نے کیا ہے، بخاری کے ہاں اس کی قبولیت کا سبب بنا ہے۔

عروہ تابعین میں سے ہیں۔ سیدہ عائشہ کے بھانجے ہیں۔ان کا شمار فقہاے سبعہ میں ہوتا ہے ۔حضرت عائشہ کی احادیث کے ماہر مانے جاتے ہیں۔ابومسعود رضی اللہ عنہ صحابی ہیں۔ایک رائے کے مطابق بدر میں شریک ہوئے۔ان کا تعلق انصار مدینہ سے ہے۔

اس حدیث میں عمر بن عبد العزیز اور مغیرہ بن شعبہ کا ذکر بھی آیا ہے۔عمر بن عبد العزیز، سلیمان بن عبد الملک کے بعد خلافت کے منصب پر فائز ہوئے۔۱۰۱ ہجری میں وفات پائی۔مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ صحابی ہیں، صلح حدیبیہ سے پہلے ایمان لائے۔ پہلے بصرہ اور پھر کوفہ کے والی رہے۔۵۰ ہجری میں وفات پائی۔ابومسعود کی ان کے ساتھ گفتگو کوفہ کی امارت ہی کے زمانے کی ہے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

قانون عبادات

(۱۳)

حج و عمرہ

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ، یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ، یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ، لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ، وَیَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی مَارَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ، فَكُلُوْا مِنْهَا، وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِیْرَ، ثُمَّ لْیَقْضُوْا تَفَثَهُمْ، وَلْیُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ، وَلْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ. (الحج ۲۲: ۲۷۔۲۹)

''اور لوگوں میں حج کی منادی کرو، وہ دور دراز کے گہرے پہاڑی راستوں سے چلتے ہوئے تمھارے پاس پیدل بھی آئیں گے اور اُن اونٹوں پر سوار ہو کر بھی جو سفر کی وجہ سے دبلے ہو گئے ہوں تاکہ اپنے لیے منفعت کی جگھوں پر پہنچیں اور چند متعین دنوں میں اپنے اُن چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اُس نے اُن کو بخشے ہیں۔ (تم اِن کو ذبح کرو) تو اِن میں سے خود بھی کھاؤ اور تنگ دست فقیروں کو بھی کھلاؤ۔ پھر چاہیے کہ یہ لوگ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں اور اِس قدیم گھر کا طواف کریں۔''

یہ صدا ہے جو صدیوں پہلے بلند ہوئی اور جس کے جواب میں 'لبیك لبیك' کہتے ہوئے ہم ام القریٰ مکہ میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی اس مسجد کے لیے عزم سفر کرتے ہیں جسے بیت الحرام کہا جاتا ہے۔ یہ وہی بیت عتیق ہے جو امام فراہی کے الفاظ میں اس وادیِ بطحا میں خدا کا پہلا گھر تھا اور جس کے حق میں ازل سے طے کر دیا گیا تھا کہ توحید سے انحراف کرنے والوں کو دور پھینکتا رہے۔ چنانچہ اس کے باشندوں نے جب بت پرستی اختیار کر لی اور اس کے جوار سے منتشر ہوئے تو

پرستش کی غرض سے اس معبد کے پتھر بھی ساتھ لیتے گئے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام بابل سے ہجرت کے بعد اس کو تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچے تو اس کی پرانی تعمیر کا صرف ایک چمکتا ہوا پتھر باقی رہ گیا تھا۔ اسمٰعیل کی قربانی کے بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا کہ اس معبد کو دوبارہ تعمیر کریں۔ چنانچہ باپ بیٹے، دونوں نے مل کر اسی یادگار پتھر کے نیچے زمین کھودنا شروع کی۔ پرانی بنیادیں کچھ تگ و دو کے بعد نکل آئیں تو انھیں بلند کیا اور اس پتھر کو عمارت کے ایک گوشے میں نصب کر دیا۔ اسمٰعیل اسی گھر کی نذر کیے گئے تھے، لہٰذا وہ اس کے خادم مقرر ہوئے اور اللہ کے حکم سے یہ صدا بلند کر دی گئی کہ لوگ اب خداوند کی نذر چڑھانے کے لیے آئیں اور یہاں آ کر توحید پر ایمان کا جو عہد انھوں نے باندھ رکھا ہے، اُسے تازہ کریں۔ اصطلاح میں اس عمل کا نام حج و عمرہ ہے۔ یہ دونوں عبادات دین ابراہیمی میں عبادت کا منتہاے کمال ہیں۔ قرآن نے صاف اعلان کیا ہے کہ اسلام درحقیقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک معاہدۂ بیع و شرا ہے جس میں ہم اپنا جان و مال اس بہشت بریں کے عوض بیچ دیتے ہیں جو پروردگار نے ہمارے لیے تیار کر رکھی ہے۔: 'ان اللّٰہ اشتری من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ'[۳۸۳]۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ: 'فاستبشروا ببیعکم الذی بایعتم بہ، وذلك ھو الفوز العظیم'[۳۸۴]۔ (سو اس سودے پر خوشی مناؤ جو تم نے اپنے پروردگار سے کیا ہے اور یہی در اصل بڑی کامیابی ہے)۔ اپنے معبود کے لیے جذبۂ پرستش کا یہ آخری درجہ ہے کہ اس کے طلب کرنے پر بندہ اپنا جان و مال، سب اُس کے حضور میں نذر کر دینے کے لیے حاضر ہو جائے۔ حج و عمرہ اسی نذر کی تمثیل ہیں۔ یہ دونوں ایک ہی حقیقت کو ممثل کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ عمرہ اجمال ہے اور حج اس لحاظ سے اس کی تفصیل کر دیتا ہے کہ اس میں وہ مقصد بھی بالکل نمایاں ہو کر سامنے آ جاتا ہے جس کے لیے جان و مال نذر کر دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ آدم کی تخلیق سے اس کی جو اسکیم دنیا میں برپا ہوئی ہے، ابلیس نے پہلے دن ہی سے اس کے خلاف اعلان جنگ کر رکھا ہے: 'قال: فبما اغویتنی، لاقعدن لھم صراطك المستقیم، ثم لاتینھم من بین ایدیھم، ومن خلفھم، وعن ایمانھم، وعن شمآئلھم، ولا تجد اکثرھم شٰکرین'[۳۸۵] (بولا: اچھا تو چونکہ تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے، اس لیے میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان کی گھات لگا کر بیٹھوں گا، پھر آگے اور پیچھے، اور دائیں اور بائیں سے ان پر تاخت کروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکرگزار نہ پائے گا)۔ قرآن کا بیان ہے کہ ابلیس کا یہ چیلنج قبول کر لیا گیا ہے اور اللہ کے بندے اب قیامت تک کے لیے اپنے اس ازلی دشمن اور اس کی ذریت کے ساتھ برسر جنگ

---

[۳۸۳] التوبہ ۹: ۱۱۱۔ ''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کے جان و مال اُن کے لیے جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔''

[۳۸۴] التوبہ ۹: ۱۱۱۔

[۳۸۵] الاعراف ۷: ۱۶۔ ۱۷۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ہیں۔[386] یہی اس دنیا کی آزمایش ہے جس میں کامیابی اور ناکامی پر ہمارے ابدی مستقبل کا انحصار ہے۔ اپنا جان و مال ہم اسی جنگ کے لیے اللہ کی نذر کرتے ہیں۔ انبیا علیہم السلام نے 'یاایھا الذین اٰمنوا، کونوا انصار اللّٰہ'[387] کی صدا تاریخ میں بارہا اسی مقصد سے بلند کی ہے۔ ابلیس کے خلاف اس جنگ کو حج میں ممثل کیا گیا ہے۔ یہ تمثیل اس طرح ہے:

اللہ کے بندے اپنے پروردگار کی ندا پر دنیا کے مال و متاع اور اس کی لذتوں اور مصروفیتوں سے ہاتھ اٹھاتے ہیں،

پھر 'لبیک لبیک' کہتے ہوئے میدان جنگ میں پہنچتے اور بالکل مجاہدین کے طریقے پر ایک وادی میں ڈیرے ڈال دیتے ہیں،

اگلے دن ایک کھلے میدان میں پہنچ کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے، اس جنگ میں کامیابی کے لیے دعا و مناجات کرتے اور اپنے امام کا خطبہ سنتے ہیں،

تمثیل کے تقاضے سے نمازیں قصر اور جمع کر کے پڑھتے اور راستے میں مختصر پڑاؤ کرتے ہوئے دوبارہ اپنے ڈیروں پر پہنچ جاتے ہیں،

پھر شیطان پر سنگ باری کرتے، اپنے جانوروں کی قربانی پیش کر کے اپنے آپ کو خداوند کی نذر کرتے، سر منڈاتے اور نذر کے پھیروں کے لیے اصل معبد اور قربان گاہ میں حاضر ہو جاتے ہیں۔

پھر وہاں سے لوٹتے اور اگلے دو یا تین دن اسی طرح شیطان پر سنگ باری کرتے رہتے ہیں۔

اس لحاظ سے دیکھیے تو حج و عمرہ میں احرام اس بات کی علامت ہے کہ بندۂ مومن نے دنیا کی لذتوں، مصروفیتوں اور مرغوبات سے ہاتھ اٹھا لیا ہے اور دو ان سلی چادروں سے اپنا بدن ڈھانپ کر وہ برہنہ سر اور کسی حد تک برہنہ پا بالکل راہبوں کی صورت بنائے ہوئے اپنے پروردگار کے حضور میں پہنچنے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا ہے۔

تلبیہ اس صدا کا جواب ہے جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بیت الحرام کی تعمیر نو کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک پتھر پر کھڑے ہو کر بلند کی تھی۔[388] اب یہ صدا دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ چکی ہے اور اللہ کے بندے اس کی نعمتوں کا اعتراف اور اس کی توحید کا اقرار کرتے ہوئے اس صدا کے جواب میں 'لبیک ،اللّٰھم لبیک' کا یہ دل نواز ترانہ پڑھتے ہیں۔

طواف نذر کے پھیرے ہیں۔ دین ابراہیمی میں یہ روایت قدیم سے چلی آ رہی ہے کہ جس کی قربانی کی جائے یا جس کو معبد کی خدمت کے لیے نذر کیا جائے، اسے معبد یا قربان گاہ کے سامنے پھرایا جائے۔ تورات کے مترجموں نے اسی بات کو جگہ جگہ ہلانے کی قربانی اور خداوند کے آگے گزراننے سے تعبیر کیا ہے۔ مثال کے طور پر گنتی میں ہے:

---

[386] الاعراف ۷: ۱۳ـــ ۱۴۔

[387] الصّف ۶۱: ۱۴۔ ''ایمان والو، اللہ کے مددگار بنو۔''

[388] تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۳/ ۲۱۶۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

''اور تو لاویوں کو خداوند کے آگے لا۔ اور بنی اسرائیل اپنے ہاتھ اُن پر رکھیں۔ اور ہارون لاویوں کو بنی اسرائیل کی طرف سے ہلانے کی قربانی کی طرح خداوند کے آگے گزرانے، تب وہ خداوند کی خدمت کے لیے مخصوص ہوں گے۔ تب لاوی اپنے ہاتھ دونوں بیلوں کے سروں پر رکھیں۔ تب تو اُن میں سے ایک کو خطا کی قربانی کے لیے اور دوسرے کو خداوند کی سوختنی قربانی کے لیے لاویوں کے کفارے کے لیے گزران۔ اور تو لاویوں کو ہارون اور اس کے بیٹوں کے سامنے کھڑا کر اور خداوند کی ہلانے کی قربانی کی طرح اُن کو گزران، کیونکہ وہ بنی اسرائیل کے درمیان سے مجھے نذر کر دیے گئے ہیں۔ میں نے بنی اسرائیل کے سب پہلوٹوں کے بدلے جو رحم کے کھولنے والے ہوں، اُن کو اپنے لیے لیا ہے۔'' (۸: ۱۰۔ ۱۶)

بائیبل کے عربی ترجمے میں اس کے لیے 'تـرددهـم للرب' یا 'امـام الرب' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے جس سے یہ مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

حجر اسود کا استلام تجدید عہد کی علامت ہے۔ اس میں بندہ اس پتھر کو تمثیلاً اپنے پروردگار کا ہاتھ قرار دے کر اس ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیتا اور عہد و میثاق کی قدیم روایت کے مطابق اس کو چوم کر اپنے اس عہد کی تجدید کرتا ہے کہ اسلام قبول کر کے وہ جنت کے عوض اپنا جان و مال، سب اللہ تعالیٰ کے سپرد کر چکا ہے۔

سعی اسمٰعیل علیہ السلام کی قربان گاہ کا طواف ہے۔ سیدنا ابراہیم نے صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر اس قربان گاہ کو دیکھا تھا اور پھر حکم کی تعمیل کے لیے ذرا تیزی کے ساتھ چلتے ہوئے مروہ کی طرف گئے تھے۔ بائیبل میں یہ واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے:

''تیسرے دن ابراہیم نے نگاہ کی اور اُس جگہ کو دور سے دیکھا۔ تب ابراہیم نے اپنے جوانوں سے کہا: تم یہیں گدھے کے پاس ٹھیرو۔ میں اور یہ لڑکا، دونوں ذرا وہاں تک جاتے ہیں اور سجدہ کر کے پھر تمھارے پاس لوٹ آئیں گے۔''

(پیدایش ۲۲: ۴۔ ۵)

چنانچہ صفا و مروہ کا یہ طواف بھی نذر کے پھیرے ہی ہیں جو پہلے معبد کے سامنے اور اس کے بعد قربانی کی جگہ پر لگائے جاتے ہیں۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جس طرح قربانی سے پہلے لگائے جاتے تھے، اسی طرح قربانی کے بعد بھی اس کا کوئی حصہ ہاتھ میں لے کر لگائے جاتے تھے۔ خروج میں ہے:

''اور تو ہارون کے تخصیصی مینڈھے کا سینہ لے کر اُس کو خداوند کے روبرو ہلانا تاکہ وہ ہلانے کا ہدیہ ہو۔ یہ تیرا حصہ ٹھیرے گا۔'' (۲۹: ۲۶)

عرفات معبد کا قائم مقام ہے، جہاں شیطان کے خلاف اس جنگ کے مجاہدین جمع ہوتے، اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور اس جنگ میں کامیابی کے لیے دعا و مناجات کرتے ہیں۔

مزدلفہ راستے کا پڑاؤ ہے، جہاں وہ رات گزارتے اور صبح اٹھ کر میدان میں اترنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر دعا و مناجات

کرتے ہیں۔

رمی ابلیس پر لعنت اور اس کے خلاف جنگ کی علامت ہے۔ یہ عمل اس عزم کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ بندۂ مومن ابلیس کی پسپائی سے کم کسی چیز پر راضی نہ ہوگا۔ یہ معلوم ہے کہ انسان کا یہ ازلی دشمن جب وسوسہ انگیزی کرتا ہے تو اس کے بعد خاموش نہیں ہو جاتا، بلکہ یہ سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ تاہم مزاحمت کی جائے تو اس کی تاخت بتدریج کمزور ہو جاتی ہے۔ تین دن کی رمی اور اس کے لیے پہلے بڑے اور اس کے بعد چھوٹے جمرات سے اسی بات کو ظاہر کیا گیا ہے۔

قربانی جان کا فدیہ ہے اور سر کے بال مونڈنا اس بات کی علامت ہے کہ نذر پیش کر دی گئی ہے اور اب بندہ اپنے خداوند کی اطاعت اور دائمی غلامی کی اس علامت کے ساتھ اپنے گھر لوٹ سکتا ہے۔ یہ دین ابراہیمی کی ایک قدیم روایت ہے۔ چنانچہ تورات میں یہ قانون بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نذر کیا جائے، وہ اپنے سر کے بال اُس وقت تک نہ منڈوائے، جب تک نذر کے دن پورے نہ ہو جائیں۔ گنتی میں ہے:

”اور اس کی نذارت کی منت کے دنوں میں اُس کے سر پر استرہ نہ پھیرا جائے، جب تک وہ مدت جس کے لیے وہ خداوند کا نذیر بنا ہے، پوری نہ ہو تب تک وہ مقدس رہے اور اپنے سر کے بالوں کی لٹوں کو بڑھنے دے۔“ (۶:۵)

”اور نذیر کے لیے شرع یہ ہے کہ جب اُس کی نذارت کے دن پورے ہو جائیں تو وہ خیمۂ اجتماع کے دروازے پر حاضر کیا جائے... پھر وہ نذیر خیمۂ اجتماع کے دروازے پر اپنی نذارت کے بال منڈوائے۔“ (۶:۱۳، ۱۸)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کس قدر غیر معمولی عبادت ہے جو ہر صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں کم سے کم ایک مرتبہ فرض قرار دی گئی ہے۔ چنانچہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کو تنبیہ فرمائی ہے کہ اس سے بے پروائی کا نتیجہ کفر ہے اور وہ اگر اپنے اس رویے پر اصرار کریں گے تو پھر اللہ کو بھی ان کی کوئی پروا نہ رہے گی۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا، وَمَنْ كَفَرَ، فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ. (آل عمران ۳:۹۷)

”اور جو سفر کی استطاعت رکھتے ہوں، اُن لوگوں پر اللہ کا حق ہے کہ بیت الحرام کا حج کریں اور جس نے انکار کیا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ دنیا والوں سے بے پروا ہے۔“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک موقع پر ایمان اور جہاد کے بعد اسی کی فضیلت بیان کی ہے۔[۳۸۹] نیز فرمایا ہے کہ جو شخص اللہ کے لیے حج کرے، پھر اس میں کوئی شہوت یا نافرمانی کی بات نہ کرے تو وہ حج سے اس طرح لوٹتا ہے، جس طرح اس کی ماں نے اسے آج جنا ہے۔[۳۹۰] اسی طرح آپ کا ارشاد ہے: عمرے کے بعد عمرہ ان کے درمیان میں ہونے والے گناہوں کے لیے

۳۸۹؎ بخاری، رقم ۲۶۔ مسلم، رقم ۱۳۵۔

۳۹۰؎ بخاری، رقم ۱۷۲۳۔ مسلم، رقم ۱۳۵۰۔

کفارہ ہے اور سچے حج کا بدلہ تو صرف جنت ہی ہے۔[391]

حج وعمرہ کی تاریخ

حج وعمرہ کی تاریخ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اس منادی سے شروع ہوتی ہے جس کا ذکر ہم اوپر جگہ جگہ کر چکے ہیں۔ اس کے بعد یہ سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی عرب کے لوگ ہر جگہ سے گروہ در گروہ حج وعمرہ کے لیے آتے تھے اور آپ کی بعثت کے بعد بھی یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کے مناسک اور رسوم و آداب میں بعض بدعتیں ان لوگوں نے داخل کر دی تھیں، لیکن روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھی میں سے بعض لوگ ان بدعتوں پر پوری طرح متنبہ بھی تھے اور اپنا حج ابراہیمی طریقے کے مطابق ہی کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں منقول ہے کہ بعثت سے پہلے جبیر بن مطعم نے آپ کو عرفات میں دیکھا تو اسے حیرت ہوئی کہ قریش کے لوگ تو مزدلفہ سے آگے نہیں جاتے اور بنی ہاشم کا یہ فرزند وقوف عرفہ کے لیے یہاں حاضر ہے۔ اس کا بیان ہے:

اضللت بعيرا لي، فذهبت اطلبه يوم عرفة، فرأيت النبي واقفا بعرفة، فقلت: هذا، والله من الحمس، فما شأنه هاهنا؟ (بخاری، رقم ۱۶۶۴)	''میرا اونٹ کھو گیا۔ عرفہ کے دن میں اسے تلاش کرتا ہوا گیا تو میں نے دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میدان عرفات میں کھڑے ہیں۔[392] میں نے خیال کیا، بخدا یہ تو قریش میں سے ہیں، پھر یہ یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

اس سے واضح ہے کہ قرآن نے جب حج کا حکم دیا تو اس کے مخاطبین کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ دین میں اس کی اہمیت اور اس کے رسوم وآداب سے پوری طرح واقف تھے اور ہر سال نہایت اہتمام کے ساتھ اس کے لیے حاضر ہوتے اور اس کے مناسک ادا کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ ان کی بدعتوں اور انحرافات کو ختم کر کے حج وعمرہ، دونوں کو ان کے اصل ابراہیمی طریقے پر بحال کر دیا۔ یہ اس عظیم عبادت کی تاریخ کا آخری باب ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے رقم ہوا ہے۔ اس کے بعد اب اس کے تمام مناسک مسلمانوں کے اجماع اور تواتر عملی سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہو رہے ہیں، ان میں کسی نوعیت کی کوئی ترمیم وتغیر یا اضافہ نہیں ہوا۔ قرآن نے جو اصلاحات، البتہ اُس وقت کی تھیں اور اب قرآن کی آیات میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دی گئی ہیں، وہ ہم یہاں بیان کیے دیتے ہیں۔

۳۹۱؎ بخاری، رقم ۱۶۸۳۔ مسلم، رقم ۱۳۴۹۔

۳۹۲؎ یہ بعثت سے پہلے کا واقعہ ہے، لیکن اس کو چونکہ جبیر بن مطعم نے مسلمان ہونے کے بعد بیان کیا ہے، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اس میں اس طریقے سے ہوا ہے۔

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

۱۔ بیت الحرام کے متولی ہونے کی وجہ سے قریش اپنا یہ حق سمجھتے تھے کہ وہ جس کو چاہیں حج و عمرہ کے لیے حرم میں آنے دیں اور جس کو چاہیں، اس کی حاضری سے محروم کر دیں۔ قرآن نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور واضح کیا کہ یہ کسی خاندان کا اجارہ نہیں ہے۔ ہر شخص جو اللہ کی عبادت اور حج و عمرہ کے لیے اس گھر کا قصد کرے، وہ قریشی ہو یا غیر قریشی، عربی ہو یا عجمی، شرقی ہو یا غربی، اس پر کسی کو کوئی پابندی عائد کرنے کا حق نہیں ہے۔ مقیم اور آفاقی، سب کے حقوق اس میں بالکل برابر ہیں۔ قریش کی حیثیت اس کے حکمرانوں اور اجارہ داروں کی نہیں ہے، بلکہ اس کے پاسبانوں اور خدمت گزاروں کی ہے۔ ان کا فرض ہے کہ اسمٰعیل علیہ السلام کی طرح وہ بھی اسے تمام دنیا کے لیے عبادت کا مرکز بنائیں اور تمام انسانوں کو دعوت دیں کہ اس کی برکتوں سے بہرہ یاب ہونے کے لیے اس آستانۂ الٰہی پر حاضر ہوں:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا، وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ، وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ، نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ. (الحج ۲۲: ۲۵)

”(اِس کے برخلاف) جو لوگ منکر ہوئے اور اب اللہ کی راہ سے اور اُس مسجد حرام سے روک رہے ہیں جس کو ہم نے اُس کے شہریوں اور باہر سے آنے والوں کے لیے یکساں ٹھیرایا ہے، (وہ یقیناً بڑے ظلم کا ارتکاب کر رہے ہیں)۔ اور (اِس مسجد کا معاملہ تو یہ ہے کہ) جو اِس میں کسی بے دینی، کسی شرک کے ارتکاب کا ارادہ کریں گے، اُن کو ہم ایک دردناک عذاب کا مزا چکھائیں گے۔“

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۲۔ شرک کی غلاظت توحید کے اس سب سے بڑے اور قدیم ترین مرکز میں بھی داخل کر دی گئی تھی۔ قرآن نے متنبہ کیا کہ ابراہیم و اسمٰعیل کو جب اس گھر کی تولیت عطا ہوئی اور انھیں یہاں آباد ہونے کے لیے کہا گیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے پہلی ہدایت یہ فرمائی تھی کہ اس طرح کی غلاظتوں سے اس گھر کو بالکل پاک رکھا جائے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ قریش کو بھی یہی کرنا چاہیے، ورنہ یہ عظیم امانت ان سے چھین کر اس کے اصل حق داروں کے سپرد کر دی جائے گی:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا، وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ، وَالْقَآئِمِيْنَ، وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ. (الحج ۲۲: ۲۶)

”اور یاد کرو، جب ابراہیم کے لیے اِس گھر کی جگہ کو ہم نے ٹھکانا بنایا، (اس ہدایت کے ساتھ) کہ کسی چیز کو ہمارے ساتھ شریک نہ کرو اور میرے اس گھر کو طواف کرنے والوں، قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔“

۳۔ اپنے بتوں کے تعلق سے بعض جانور قریش نے حرام قرار دے رکھے تھے[۳۹۳]۔ چنانچہ وہ ان کی قربانی بھی نہیں کرتے تھے۔

اسی طرح اس گھر سے متعلق سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی مقدس روایات بھی اپنے دنیوی مفادات کی خاطر انھوں نے بڑی حد تک بدل ڈالی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر انھیں تنبیہ کی اور بتایا کہ جانور وہی حرام ہیں جن کی وضاحت قرآن میں کر دی گئی ہے، اس لیے اس 'افتراء علی اللّٰه' سے بچو اور اللہ کی قائم کردہ تمام حرمتوں کی تعظیم بجا لاؤ۔ یہی تمھارے حق میں بہتر ہے:

ذٰلِكَ، وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ، وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ، فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ، وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ، حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ، وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ، فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ، فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ . ذٰلِكَ، وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ، فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ. (الحج ۲۲: ۳۰۔۳۲)

''ان چیزوں کا اہتمام کرو، اور (یاد رکھو کہ) جو اللہ کی قائم کردہ حرمتوں کی تعظیم کرے گا تو یہ اُس کے پروردگار کے نزدیک اُس کے لیے بہتر ہے۔ اور تمھارے لیے چوپائے حلال کیے گئے ہیں، سوائے اُن کے جو تمھیں سنا دیے گئے ہیں۔ سو بتوں کی غلاظت سے اجتناب کرو اور اُس جھوٹ سے اجتناب کرو، (جو تم خدا پر باندھتے ہو)، ایک اللہ کی طرف یک سو ہو کر، اُس کے شریک بنا کر نہیں، اور (یاد رکھو کہ) جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرائے گا تو گویا وہ آسمان سے گر گیا، پھر پرندے اُس کو اچک لے جائیں گے یا ہوا اُس کو کسی دور دراز جگہ میں لے جا کر پھینک دے گی۔ ان چیزوں کا اہتمام کرو، اور (یاد رکھو کہ) جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر کی تعظیم کرے گا تو (اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ) یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۴۔ قربانی کے جانوروں سے کوئی فائدہ اٹھانا بالعموم ممنوع سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے خاص کر دینے کے بعد لوگ نہ ان کا دودھ استعمال کرتے تھے اور نہ ان سے بار برداری کا کوئی کام لیتے تھے۔[۳۹۴] قرآن نے وضاحت فرمائی کہ ان شعائر کی تعظیم کے لیے یہ چیز ضروری نہیں ہے۔ قربانی کا وقت آ جانے تک ان جانوروں سے ہر طرح کا فائدہ اٹھانا بالکل جائز ہے:

لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى، ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ. (الحج ۲۲: ۳۳)

''(قربانی) کے اِن (جانوروں) سے تم ایک وقت مقرر تک فائدے اٹھا سکتے ہو، پھر ان کو اِسی قدیم گھر تک پہنچنا ہے۔''

۵۔ عرب میں یہود بھی تھے اور ایک کمزور روایت کی بنا پر انھوں نے اونٹ کو حرام قرار دے رکھا تھا۔[۳۹۵] اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ

۳۹۳؎ الانعام ۶: ۱۳۸۔۱۵۰۔

۳۹۴؎ بخاری، رقم ۱۶۰۴۔ مسلم، رقم ۱۳۲۲۔

یہ محض واہمہ ہے، لہٰذا اونٹ کی قربانی بھی بغیر کسی تردد کے کی جائے گی۔ بلکہ عربوں کو یہ جانور چونکہ نہایت عزیز ہے، لہٰذا وہ اگر اپنے پروردگار کی خوشنودی کے لیے اس کی قربانی کریں گے تو ان کے لیے یقیناً یہ اللہ کے تقرب کا بہت بڑا ذریعہ ہو گی:

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ، لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ، فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ، فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا، فَكُلُوْا مِنْهَا، وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ، كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ، لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. (الحج ۲۲:۳۶)

''اور قربانی کے اونٹوں کو بھی ہم نے تمھارے لیے اللہ کے شعائر ٹھیرایا ہے۔ ان میں تمھارے لیے بھلائی ہے۔ سو ان کی قطار بنا کر ان پر اللہ کا نام لو۔ پھر جب وہ اپنے پہلووں پر گر پڑیں تو اُن میں سے خود بھی کھاؤ اور اُن کو بھی کھلاؤ جو قناعت کیے بیٹھے ہیں اور اُن کو بھی جو مانگنے کے لیے آ جائیں۔ اسی طرح ہم نے اِن (جانوروں) کو تمھاری خدمت میں لگا دیا ہے تاکہ تم شکر گزار بنو۔''

۶۔ قربانی کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کے گوشت اور خون سے محظوظ ہوتا ہے۔ قرآن نے متنبہ کیا کہ یہ محض حماقت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے نہیں، بلکہ اس تقویٰ سے محظوظ ہوتا ہے جو ان قربانیوں سے ان کے پیش کرنے والوں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا، وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ، كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ، لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ، وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ. (الحج ۲۲:۳۷)

''اللہ کو نہ (تمھاری) اِن (قربانیوں) کا گوشت پہنچتا ہے، نہ خون، بلکہ صرف تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اُس نے اِسی طرح اِن کو تمھاری خدمت میں لگا دیا ہے تاکہ اللہ نے جو ہدایت تمھیں بخشی ہے، اُس پر تم اُس کی تکبیر کرو۔ (یہی طریقہ ہے اُن کا جو خوبی کا رویہ اختیار کریں) اور (اے پیغمبر) اِن خوب کاروں کو بشارت دو۔''

۷۔ مروہ سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کی قربان گاہ ہے۔ یہود چونکہ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے، اس لیے صفا و مروہ کے طواف کے بارے میں بھی طرح طرح کے شبہات پیدا کرتے رہتے تھے۔ قرآن نے اس کتمان حق پر انھیں تنبیہ کی اور صاف واضح کر دیا کہ یہ دونوں پہاڑیاں اللہ کے شعائر میں سے ہیں اور ان کا طواف ایک نیکی کا کام ہے۔ کسی مسلمان کو اس معاملے میں کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے:

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ، فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ، فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ

''صفا اور مروہ یقیناً اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جو اس گھر کا حج یا عمرہ کرنے کے لیے آئیں، اُن پر

---

۳۹۵ استثنا ۱۴:۷۔

أَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا، وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ، اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ، اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ، وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ. (البقرہ۲: ۱۵۸۔۱۵۹)

کوئی حرج نہیں کہ وہ ان کا طواف بھی کر لیں، (بلکہ یہ ایک نیکی کا کام ہے) اور جس نے اپنے شوق سے نیکی کا کوئی کام کیا، اللہ اُسے قبول کرنے والا ہے، اُس سے پوری طرح باخبر ہے۔ (اِس معاملے میں) جو حقائق ہم نے نازل کیے اور جو ہدایت بھیجی تھی، اُسے جو لوگ چھپاتے ہیں، اس کے باوجود کہ اِن لوگوں کے لیے اپنی کتاب میں ہم نے اُسے کھول کر بیان کر دیا تھا، یقیناً وہی ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی جن پر لعنت کریں گے۔''

۸۔ حج کے سلسلے میں ایک بدعت یہ بھی ایجاد کر لی گئی تھی کہ حج سے واپسی پر اور احرام کی حالت میں لوگ اپنے گھروں میں ان کے دروازوں سے نہیں، بلکہ پیچھے سے داخل ہوتے تھے[۳۹۶]۔ اس عجیب و غریب حرکت کا محرک غالباً یہ وہم تھا کہ جن دروازوں سے گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے نکلے ہیں، پاک ہو جانے کے بعد بھی انھی سے گھروں میں داخل ہونا اب خلاف تقویٰ ہے۔ قرآن نے اس احمقانہ حرکت سے روکا اور فرمایا کہ یہ ہرگز کوئی نیکی کا کام نہیں ہے، اس لیے اب اس کا اعادہ نہیں ہونا چاہیے:

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا، وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى، وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا، وَاتَّقُوا اللّٰهَ، لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. (البقرہ۲: ۱۸۹)

''یہ ہرگز کوئی نیکی نہیں ہے کہ (احرام کی حالت میں اور حج سے واپسی پر) تم گھروں کے پیچھے سے داخل ہوتے ہو، بلکہ نیکی تو اصل میں اس کی ہے جو تقویٰ اختیار کرے۔ اور گھروں میں اُن کے دروازوں ہی سے آؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تمھیں فلاح نصیب ہو جائے۔''

۹۔ زمانۂ جاہلیت میں حج نے عبادت سے زیادہ ایک نیم مذہبی میلے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ لوگ اس کے لیے ہر طرح کا اہتمام کرتے، لیکن اس بات کو بہت کم اہمیت دیتے تھے کہ اس سفر میں اصل زادِ راہ تقویٰ کا زادِ راہ ہے اور وہ حج کے لیے نکلے ہیں تو انھیں اب کوئی شہوت یا نافرمانی یا لڑائی جھگڑے کی بات نہیں کرنی چاہیے۔ یہ اس عظیم عبادت کی روح کے منافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرف توجہ دلائی اور فرمایا کہ اس سفر کے لیے آدمی کو سب سے زیادہ اسی تقویٰ کے زادِ راہ کا اہتمام کرنا چاہیے:

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ، فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ، فَلَا رَفَثَ، وَلَا فُسُوْقَ، وَلَا جِدَالَ

''حج کے متعین مہینے ہیں۔ سو ان میں جو شخص بھی (احرام باندھ کر) حج کا ارادہ کر لے، اُسے پھر حج کے اس زمانے

۳۹۶؎ المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، جواد علی ۶/ ۳۷۱۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

فِی الْحَجِّ، وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ، یَّعْلَمْهُ اللّٰہُ، وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ تَّقْوٰی، وَاتَّقُوْنِ یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ. (البقرہ۲:۱۹۷)

میں نہ کوئی شہوت کی بات کرنی ہے، نہ خدا کی نافرمانی کی اور نہ لڑائی جھگڑے کی کوئی بات اُس سے سرزد ہونی چاہیے۔اور (یاد رہے کہ) جو نیکی بھی تم کرو گے، اللہ اُسے جانتا ہے۔اور (حج کے اس سفر میں تقویٰ کا) زادراہ لے کر نکلو، اس لیے کہ بہترین زادراہ یہی تقویٰ کا زادراہ ہے۔ اور عقل والو، مجھ سے ڈرتے رہو۔''

۱۰۔حج کے بارے میں اسی غفلت کا نتیجہ تھا کہ لوگ مزدلفہ پہنچتے تو وہاں تسبیح وتہلیل اور ذکر وعبادت کے بجائے بیع وشرا، تجارت اور اس طرح کے دوسرے کاموں کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔قرآن نے بتایا کہ اس میں تو کوئی مضایقہ نہیں کہ حج کے ساتھ آدمی بیع وشرا کی نوعیت کا کوئی کام کر لے، لیکن حج کے مقامات ان چیزوں کی جگہ نہیں ہیں، علم ومعرفت کی یہ جلوہ گاہیں تو صرف اللہ کی یاد کے لیے خاص رہنی چاہییں:

لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ، فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ، وَاذْکُرُوْہُ کَمَا ھَدٰکُمْ، وَاِنْ کُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِہٖ لَمِنَ الضَّآلِّیْنَ. (البقرہ۲:۱۹۸)

''اس میں کوئی حرج نہیں کہ (حج کے اس سفر میں) تم اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرو، لیکن (یاد رہے کہ مزدلفہ کوئی کھیل تماشے اور تجارت کی جگہ نہیں ہے، اس لیے) جب عرفات سے چلو تو مشعر الحرام کے پاس اللہ کو یاد کرو اور اسی طرح یاد کرو، جس طرح اس نے تمھیں ہدایت فرمائی ہے۔اور اس سے پہلے تو بلا شبہ تم لوگ گمراہوں میں سے تھے۔''

۱۱۔قریش نے اپنے لیے یہ امتیاز قائم کر لیا تھا کہ مزدلفہ سے آگے نہیں جاتے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ وہ بیت اللہ کے پروہت اور مجاور ہیں، لہٰذا ان کے لیے حدود حرم سے باہر نکلنا مناسب نہیں ہے[۳۹۷]۔اللہ تعالیٰ نے یہ توجیہ قبول نہیں کی اور حکم دیا کہ انھیں بھی عرفات میں اسی طرح حاضر ہونا چاہیے، جس طرح دوسرے سب لوگ ہوتے ہیں:

ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ، وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰہَ، اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ. (البقرہ۲:۱۹۹)

''پھر (یہ بھی ضروری ہے کہ) جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں، تم بھی (قریش کے لوگو)، وہیں سے پلٹو اور اللہ سے مغفرت چاہو۔یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، اس کی شفقت ابدی ہے۔''

۳۹۷۔ المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، جواد علی ۶/ ۳۸۲۔

۱۲۔ منیٰ کے ایام بھی زیادہ تر قصیدہ خوانی، داستان گوئی اور مفاخرت کی مجلسوں میں گزرتے تھے۔[398] پھر یہی نہیں، بعض لوگ حج جیسی عظیم عبادت کو بھی اپنے دنیوی مفادات کے حوالے ہی سے دیکھتے تھے اور اس موقع پر بھی اللہ سے اگر کچھ مانگتے تو اسی دنیا کے لیے مانگتے تھے۔ قرآن نے اس پر تنبیہ کی اور فرمایا کہ اس طرح کے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا:

فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِکَکُمْ، فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ اٰبَآئَکُمْ، اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا، فَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا، وَّمَا لَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ خَلَاقٍ. وَمِنْھُمْ مَّنْ یَّقُوْلُ: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً، وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً، وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ، اُولٰٓئِکَ لَھُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا کَسَبُوْا، وَاللّٰہُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ. (البقرہ ۲:۲۰۰)

''اس کے بعد جب حج کے مناسک پورے کر لو تو جس طرح پہلے اپنے باپ دادا کو یاد کرتے رہے ہو، اسی طرح اب اللہ کو یاد کرو، بلکہ اُس سے بھی زیادہ۔ (یہ اللہ سے مانگنے کا موقع ہے)، مگر لوگوں میں ایسے بھی ہیں کہ وہ (اس موقع پر بھی) یہی کہتے ہیں کہ پروردگار، ہمیں دنیا میں دے دے، اور (اِس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پھر) آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں رہتا۔ اور ایسے بھی ہیں کہ جن کی دعا یہ ہوتی ہے کہ پروردگار، ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی، اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے۔ یہی ہیں جو اپنی کمائی کا حصہ پا لیں گے، اور اللہ کو حساب چکاتے کبھی دیر نہیں لگتی۔''

۱۳۔ منیٰ میں قیام کے بارے میں ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ اس کے دن ۱۳/ ذوالحجہ تک ہیں یا آدمی اگر ۱۲ کو بھی واپس چلا آئے تو اس میں کوئی حرج نہ ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ دونوں ہی صورتوں میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ اصل اہمیت اس کی نہیں کہ لوگ کتنے دن ٹھیرے، بلکہ اس کی ہے کہ جتنے دن بھی ٹھیرے، خدا کی یاد میں اور اس سے ڈرتے ہوئے ٹھیرے:

وَاذْکُرُوا اللّٰہَ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ، فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ، وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ لِمَنِ اتَّقٰی، وَاتَّقُوا اللّٰہَ، وَاعْلَمُوْٓا اَنَّکُمْ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ. (البقرہ ۲:۲۰۳)

''اور (منیٰ کے) چند متعین دنوں میں اللہ کو یاد کرو۔ پھر جس نے جلدی کی اور دو ہی دنوں میں چل کھڑا ہوا، اُس پر بھی کوئی گناہ نہیں اور جو دیر سے چلا اُس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ (ہاں، مگر) اُن کے لیے جو اللہ سے ڈریں اور تم بھی اللہ سے ڈرتے رہو، اور خوب جان لو کہ (ایک دن) تم اُسی کے حضور میں اکٹھے کیے جاؤ گے۔''

---

۳۹۸ المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، جواد علی ۶/ ۳۹۰۔

۱۴۔اس سلسلہ کی بدترین چیز عریاں طواف کی بدعت تھی۔ بیت اللہ میں اس غرض سے لکڑی کا ایک تختہ رکھا ہوا تھا جس پر لوگ کپڑے اتار اتار کر رکھ دیتے تھے۔ پھر صرف قریش کی فیاضی ہی ان کی ستر پوشی کرتی تھی۔ اُن کے مرد مردوں کو اور عورتیں عورتوں کو کپڑے مستعار دیتی تھیں، لیکن جو لوگ محروم رہ جاتے تھے، وہ برہنہ طواف کرتے اور اسی کو نیکی سمجھتے تھے۔[۳۹۹] قرآن نے اسے ممنوع قرار دیا اور فرمایا کہ عبادت کی ہر جگہ پر آدمی کو ستر چھپا کر اور پورا لباس پہن کر جانا چاہیے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ، خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ. (الاعراف ۷:۳۱)

''آدم کے بیٹو، ہر مسجد کی حاضری کے وقت اپنے لباس سے آراستہ رہو۔''

حج وعمرہ کا مقصد

حج وعمرہ کا مقصد وہی ہے جو اس کی حقیقت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف، اس کی توحید کا اقرار اور اس بات کی یاددہانی کہ اسلام قبول کر کے ہم اپنے آپ کو پروردگار کی نذر کر چکے ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کی معرفت اور دل ودماغ میں جن کے رسوخ کو قرآن نے مقامات حج کے منافع سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ سورۂ حج کی جو آیت ابتدا میں نقل ہوئی ہے، اس میں حج کے مناسک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: 'ليشهدوا منافع لهم' (تاکہ وہ اپنے لیے منفعت کی جگہوں پر حاضر ہوں)۔ یہ مقصد ذکر کے ان الفاظ سے نہایت خوبی کے ساتھ واضح ہوتا ہے جو اس عبادت کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسی مقصد کو نمایاں رکھنے اور ذہنوں میں پوری طرح راسخ کر دینے کے لیے منتخب کیے گئے ہیں۔ چنانچہ احرام باندھ لینے کے بعد یہ الفاظ ہر شخص کی زبان پر مسلسل جاری رہتے ہیں:

لبيك، اللّٰهم لبيك؛ لبيك لا شريك لك، لبيك؛ ان الحمد و النعمة لك، و الملك؛ لا شريك لك.

''میں حاضر ہوں، اے اللہ، حاضر ہوں؛ حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں؛ میں حاضر ہوں، حمد تیرے لیے ہے، سب نعمتیں تیری ہیں اور بادشاہی بھی تیرے ہی لیے ہے؛ تیرا کوئی شریک نہیں۔''

حج وعمرہ کے ایام

عمرہ کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ یہ پورے سال میں لوگ جب چاہیں، کر سکتے ہیں۔ حج کے لیے، البتہ ۸/ ذوالحجہ سے ۱۳/ ذوالحجہ تک کے ایام مقرر ہیں اور یہ انھی ایام میں ہوسکتا ہے۔ لوگوں کو اس عبادت کے لیے چونکہ اقصائے عالم سے

۳۹۹؎ المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، جواد علی ۶/۳۵۹۔

سرزمین عرب کے شہر مکہ پہنچنا ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے سفر کو محفوظ رکھنے کی غرض سے چار مہینے لڑنے بھڑنے اور جنگ وجدال کے لیے ممنوع قرار دیے ہیں۔ یہ مہینے رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم ہیں۔ ان میں سے رجب کا مہینا عمرے کے لیے اور باقی تین حج کے لیے خاص کیے گئے ہیں۔ ان مہینوں کی یہ حرمت ہمیشہ سے قائم چلی آ رہی ہے، اس معاملے میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ، يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ، مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ، ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ، فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ. (التوبہ ۹: ۳۶)	''اللہ کے نزدیک مہینوں کی تعداد نوشتۂ الٰہی میں اُس دن سے بارہ ہی ہے، جب اُس نے آسمان وزمین کو پیدا کیا۔ ان میں چار مہینے حرام ہیں۔ یہی دین قیم ہے، لہٰذا اِن میں تم اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔''

حج وعمرہ کے مقامات

حج وعمرہ کے مقامات کو اللہ تعالیٰ نے اپنے شعائر قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'ان الصفا والمروة من شعائر اللّٰه' (صفا مروہ یقیناً اللہ کے شعائر میں سے ہیں)۔ یہ 'شعيرة' کی جمع ہے جس کے معنی علامت کے ہیں۔ اصطلاح میں اس سے مراد وہ مظاہر ہیں جو کسی حقیقت کا شعور ذہنوں میں قائم رکھنے کے لیے اللہ ورسول کی طرف سے بطور ایک نشان کے مقرر کیے گئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ان کی تعظیم کی جائے تو یہ دلوں کا تقویٰ ہے[۴۰۰]۔

ان کا تعارف درج ذیل ہے:

مواقیت

حج وعمرہ کی غرض سے آنے والوں کے لیے حدود حرم سے کچھ فاصلے پر بعض جگہیں متعین کر دی گئی ہیں، جن سے آگے وہ احرام کے بغیر نہیں جا سکتے۔ ان پر یا ان کے برابر کسی بھی جگہ پر پہنچ کر ضروری ہے کہ احرام باندھ لیا جائے۔ اصطلاح میں انھیں میقات کہا جاتا ہے۔ یہ جگہیں پانچ ہیں: مدینہ سے آنے والوں کے لیے ذوالحلیفہ، یمن سے آنے والوں کے لیے یلملم، مصر وشام سے آنے والوں کے لیے جحفہ، نجد سے آنے والوں کے لیے قرن اور مشرق کی طرف سے آنے والوں کے لیے ذات عرق۔

بیت الحرام

یہ وہی معبد ہے جسے قرآن میں 'البیت'، 'البیت العتیق' اور 'المسجد الحرام' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے[۴۰۱]۔ اس

۴۰۰۔ الحج ۲۲: ۳۲۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کی عمارت چونکہ مکعب بنائی گئی ہے، اس لیے اسے خانۂ کعبہ بھی کہتے ہیں۔ یہ سرزمین عرب کے شہر مکہ میں واقع ہے۔ قرآن میں اس شہر کا نام 'بکۃ' آیا ہے[۲۰۲] جس کے معنی آباد جگہ کے ہیں۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی تقریباً ۲۷۷ میٹر ہے اور یہ چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی آمد سے پہلے مکہ غیر آباد تھا۔ قدیم عربوں کا ایک قبیلہ جرہم، البتہ اس علاقے کا حکمران تھا اور مکہ ہی کے قرب وجوار میں رہتا تھا۔ اسمٰعیل علیہ السلام کی شادی اسی قبیلہ کی ایک لڑکی سیدہ بنت مضاض سے ہوئی تھی۔[۲۰۳] ان کے فرزند نابت کی وفات کے بعد اس شہر کا اقتدار اسی قبیلہ کے ہاتھ میں چلا گیا اور وہ کئی سو سال تک اس پر حکومت کرتے رہے۔ پھر بنوخزاعہ اور بنوبکر نے اس شہر پر قبضہ کر لیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کم و بیش ایک صدی پہلے خزاعہ کے سردار حلیل بن حبشیہ کی وفات ہوئی تو قصی بن کلاب نے اسے دوبارہ حاصل کیا اور بنی اسمٰعیل کی حکومت ایک مرتبہ پھر اس شہر پر قائم ہوگئی۔[۲۰۴]

سیدنا ابراہیم علیہ السلام تقریباً چار ہزار سال پہلے جب اللہ کے حکم سے یہاں آئے تو بیت الحرام امتداد زمانہ اور سیلاب کی ستم رانیوں سے گر چکا تھا اور اس کا کوئی نام ونشان بھی باقی نہیں رہا تھا۔ پروردگار سے الہام پا کر انھوں نے اس کی پرانی بنیادیں دریافت کیں اور اپنے فرزند اسمٰعیل کی مدد سے ایک بے چھت کی عمارت کھڑی کر دی۔[۲۰۵] ان کے مقدس ہاتھوں کی یہ تعمیر بھی گردش ایام سے محفوظ نہ رہی اور بالآخر منہدم ہوگئی۔ اس کے بعد پہلے عمالقہ نے اور پھر قبیلۂ جرہم نے اسے تعمیر کیا۔[۲۰۶] بعض حوادث کی وجہ سے جرہم کی بنائی ہوئی عمارت بھی گر گئی تو قریش نے اس کی تعمیر نو کا بندوبست کیا، لیکن سرمایہ کم پڑ جانے کی وجہ سے یہ عمارت اصل ابراہیمی بنیادوں پر قائم نہ ہوسکی۔ یہ واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پانچ سال پہلے پیش آیا۔ چنانچہ آپ بھی تعمیر کے اس کام میں شریک رہے، بلکہ مورخین کا بیان ہے کہ حجر اسود کے دوبارہ نصب کرنے کا قضیہ آپ ہی کے حسن تدبیر سے طے ہوا۔[۲۰۷]

روایتوں میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر سیدہ عائشہ کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ قریش کی

۲۰۱؎ الحج ۲۲: ۲۵-۲۹۔

۲۰۲؎ آل عمران ۳: ۹۶۔

۲۰۳؎ الروض الانف، السہیلی ۱/ ۱۲۔

۲۰۴؎ السیرۃ النبویۃ، ابن ہشام ۱/ ۹۳-۱۰۴۔

۲۰۵؎ اخبار مکۃ، الازرقی ۱/ ۵۸-۶۲۔

۲۰۶؎ شرح المواہب اللدنیہ، الزرقانی ۱/ ۲۰۶۔

۲۰۷؎ السیرۃ النبویۃ، ابن ہشام ۱/ ۱۶۰۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تالیف قلب ملحوظ نہ ہوتی تو اس کا جو حصہ عمارت سے باہر رہ گیا ہے اور حطیم کہلاتا ہے، آپ اسے عمارت میں شامل کر کے بیت اللہ کو اس کی اصل ابراہیمی بنیادوں پر استوار کر دیتے۔[۴۰۸] عبداللہ بن زبیر نے آپ کی اسی خواہش کے پیش نظر قریش کی بنائی ہوئی عمارت کو گرا کر اپنے زمانۂ خلافت میں اسے ازسرنو تعمیر کیا تھا، لیکن حجاج نے جب اُن کے خلاف جنگ میں سنگ باری کی تو یہ عمارت بھی ٹوٹ گئی۔ اُن کی شہادت کے بعد اس نے عبدالملک بن مروان کے حکم سے اس کو منہدم کر کے ایک مرتبہ پھر قریش کی قائم کی ہوئی بنیادوں پر تعمیر کر دیا۔[۴۰۹] اس کے بعد سے یہ اسی طرح قائم ہے۔

حجر اسود اس عمارت کے کونے میں نصب ہے۔ اس سے آگے عمارت کا شمالی کونا رکن عراقی، مغربی کونا رکن شامی اور جنوبی کونا رکن یمانی کہلاتا ہے۔ بیت الحرام کا دروازہ زمین سے کوئی دو میٹر اونچا ہے۔ اس کے اور حجر اسود کے درمیان کی دیوار کو ملتزم کہا جاتا ہے۔ یہ گویا آستانۂ الٰہی کی دہلیز ہے جس سے چمٹ کر لوگ دعائیں کرتے ہیں۔ عمارت پر سیاہ کپڑے کا ایک غلاف پڑا رہتا ہے جسے ہر سال تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ عمارت کے صحن میں سفید رنگ کا ایک پتھر رکھا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اسی پر کھڑے ہو کر اس کی دیواریں بلند کی تھیں۔[۴۱۰] اس پتھر سے کچھ فاصلے پر ایک قدرتی چشمہ ہے جسے زمزم کہتے ہیں۔ بیت الحرام کی زیارت کے لیے آنے والے اس سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔

اس کے حدود چاروں طرف کئی کلومیٹر تک وسیع اور ہمیشہ سے معلوم اور متعین ہیں۔ یہ پورا علاقہ حرم کہلاتا ہے، جس میں کسی انسان یا جانور، حتیٰ کہ آپ سے آپ اگنے والی نباتات کو بھی نقصان پہنچانا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ قرآن نے 'حرما آمنا'[۴۱۱] اور 'مثابة للناس وامنا'[۴۱۲] کے الفاظ میں اس کی یہی حیثیت بیان فرمائی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ان ھذا البلد حرمہ اللّٰہ یوم خلق السمٰوات والارض ، فھو حرام بحرمة اللّٰہ الی یوم القیٰمة، وانہ لم یحل القتال فیہ لاحد قبلی، ولم یحل لی الا ساعة

”یہ وہ شہر ہے جسے اللہ نے اُس دن سے حرام ٹھیرایا ہے، جب اُس نے زمین وآسمان پیدا فرمائے تھے۔ لہٰذا اللہ کی قائم کردہ اسی حرمت کی وجہ سے یہ قیامت تک کے لیے حرام ہے۔ مجھ سے پہلے کسی شخص کو اس میں قتال کی

۴۰۸؎ بخاری، رقم ۱۵۰۶، ۱۵۰۸۔ مسلم، رقم ۱۳۳۳۔

۴۰۹؎ بخاری، رقم ۱۵۰۹۔ مسلم، رقم ۱۳۳۳۔

۴۱۰؎ اخبار مکة، الازرقی ۱/ ۵۹۔

۴۱۱؎ القصص ۲۸: ۵۷۔ العنکبوت ۲۹: ۶۷۔

۴۱۲؎ البقرہ ۲: ۱۲۵۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

من نهار، فهو حرام بحرمة الله الى يوم القيٰمة، لايعضد شوكه، ولا ينفر صيده، ولايلتقط الا من عرفها، ولايختلٰى خلاها. (مسلم، رقم ۱۳۵۳)

اجازت نہیں دی گئی۔ میرے لیے بھی یہ دن کی ایک گھڑی ہی کے لیے حلال کیا گیا۔ چنانچہ اللہ کی قائم کردہ اسی حرمت کی وجہ سے یہ اب بھی قیامت تک حرام ہی رہے گا، نہ اس کے کانٹوں والے درخت کاٹے جائیں گے، نہ اس کے شکار کو بھگایا جائے گا، نہ اس میں گری ہوئی کوئی چیز اٹھائی جائے گی، الاّ یہ کہ کوئی اسے مالک تک پہنچانے کے لیے اٹھائے، اور نہ اس کی گھاس کاٹی جائے گی۔''

صفا و مروہ

یہ دو پہاڑیاں ہیں جو بیت اللہ کے بالکل قریب واقع ہیں۔ سیدنا اسمٰعیل کی قربانی کا واقعہ انھی میں سے ایک پہاڑی مروہ پر پیش آیا تھا۔ اس لحاظ سے یہی اصل قربان گاہ ہے جسے لوگوں کی سہولت کے لیے منیٰ تک وسعت دے دی گئی ہے۔ اس قربان گاہ کے طواف میں ہر پھیرا صفا سے شروع ہو کر مروہ پر ختم ہوتا ہے۔ اصطلاح میں اسے سعی کہتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

منیٰ

دو پہاڑیوں کے درمیان یہ ایک وسیع میدان ہے جس کا فاصلہ مکہ سے تقریباً پانچ کلومیٹر ہے۔ ۸/ ذوالحجہ کو مکہ سے آنے کے بعد اور ۱۰/ ذوالحجہ کو عرفات سے واپس آ کر حجاج یہیں قیام کرتے اور حج کے باقی مناسک پورے کرتے ہیں۔

عرفات

منیٰ سے تقریباً دس کلومیٹر کے فاصلے پر یہ بھی ایک وسیع میدان ہے جہاں ۹/ ذوالحجہ کو مسلمانوں کا امام خطبہ دیتا اور اس کے بعد حجاج غروب آفتاب تک وقوف کرتے ہیں۔

مزدلفہ

منیٰ کے راستے میں یہ ایک دوسرا میدان ہے جہاں عرفات سے واپسی کے بعد حجاج رات گزارتے ہیں۔ یہ منیٰ اور عرفات کے تقریباً درمیان میں واقع ہے۔ حدود حرم یہاں سے شروع ہوتے ہیں، اس لیے اسے 'المشعر الحرام' بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن میں اس کا یہی نام آیا ہے۔[213]

جمرات

منیٰ کے میدان میں یہ تین ستون ہیں جنھیں شیطان کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک ستون سب سے بڑا

---

[213] البقرہ ۲: ۱۹۸۔

ہے، اسے جمرۂ عقبہ یا جمرۃ الاخریٰ کہتے ہیں۔ دوسرے دو ستون جمرۃ الاولیٰ اور جمرۃ الوسطیٰ کے نام سے موسوم ہیں۔ عرفات سے واپس آ کر حجاج انھی ستونوں پر سنگ باری کرتے ہیں۔

[باقی]

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نعیم احمد بلوچ

مصعب اسکول سسٹم کے طلبہ کی شان دار کامیابی

مصعب اسکول سسٹم کا قیام ۱۹۹۴ء میں عمل میں لایا گیا۔ جدید تعلیم بہترین وسائل کے ساتھ مہیا کرنے والے اسکولوں کی موجودگی میں ایک نئے اسکول کا قیام بظاہر ایک درست اقدام معلوم نہیں ہوتا تھا، لیکن مصعب کو قائم کرنے والوں کے پیش نظر یہ مقصد تھا کہ بچے مناسب دینی ماحول کے اندر رہ کر جدید تعلیم حاصل کریں تاکہ وہ جدید تعلیم کے ساتھ منسلک بے خدا تہذیب کے مفاسد سے محفوظ رہ سکیں اور ان کے اندر اسلامی اقدار سے وابستگی کا جذبہ نہ صرف زندہ رہے، بلکہ پروان چڑھ سکے۔

جناب جاوید احمد غامدی کی سرپرستی میں ان اہداف کو پیش نظر رکھ کر اسکول نے دستیاب وسائل کے ساتھ پہلی جماعت سے تدریس کا آغاز کیا۔ اسکول کے یہ اولین طلبہ جب نویں دسویں تک پہنچے تو انتظامیہ نے میٹرک کے بجائے ''اولیول'' کا بین الاقوامی نظام اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ اس اعتماد کا آئینہ دار تھا کہ انتظامیہ نے پچھلے برسوں کے دوران میں اپنے طالب علموں کی تدریس اس نہج پر کی ہے کہ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں رائج جدید ترین نصاب کو نہ صرف سمجھ سکتے ہیں، بلکہ اس کے امتحانات میں نمایاں کارکردگی کے ساتھ کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ اولیول کی کلاس تک پہنچتے ہوئے اسکول کے ان اولین طلبہ پر اگرچہ کچھ تجربات بھی کیے گئے اور وسائل کی کمی بھی مثالی سطح پر تدریس میں رکاوٹ بنی رہی، لیکن اس سب کے باوجود اسکول انتظامیہ طلبہ کی بہترین کارکردگی کے لیے پر اعتماد رہی۔ مناسب افراد کار کی عدم فراہمی اور وسائل کی کمی کے باوجود دوران تدریس میں طلبہ کی تعلیم وتربیت کے ان پہلوؤں کا بہر حال خاص خیال رکھا گیا کہ:

۱۔ عربی زبان اور قرآن مجید کی تدریس اگرچہ اولیول کے نصاب کا حصہ نہیں ہے، لیکن اس کی تدریس کا جاری سلسلہ برقرار رکھا گیا۔

۲۔ اسباق کو بغیر سمجھے یاد کرنے کی شدید حوصلہ شکنی کی گئی، اس کے بجائے طلبہ میں فہم وشعور کے ساتھ اپنی علمی استعداد کو

بڑھانے کی عادت ڈالی گئی۔

۳۔اسکول میں تدریس کا معیار اس قدر کڑا رکھا جائے کہ کسی طالب علم کو اضافی ٹیوشن کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ اگر کہیں اس کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اسکول انتظامیہ نے خود اضافی کلاسوں کا اہتمام کیا۔

۴۔غیر نصابی سرگرمیوں میں ان طلبہ کی شرکت کو یقینی بنایا گیا۔ چنانچہ او لیول کے طلبا و طالبات، سکول کے زیر اہتمام ہونے والے تمام مقابلوں، تقریبوں اور دوسری ہم نصابی سرگرمیوں میں ہراول دستے کے طور پر نمایاں رہے۔

۵۔طلبا و طالبات کے اندر آگے بڑھنے اور اعلیٰ نصب العین کے حصول کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے انھیں معاشرے میں نمایاں مقام حاصل کرنے والے دانش وروں اور صاحب علم لوگوں کی محافل میں لے جانے کا بھی اہتمام کیا جاتا رہا۔

چنانچہ اس نہج پر تعلیم حاصل کرنے کے بعد مصعب اسکول سسٹم کا پہلا بیچ والدین، اساتذہ اور انتظامیہ کی دعاؤں کے ساتھ امتحانات میں شامل ہوا۔ جون ۲۰۰۴ میں منعقد ہونے والے ان امتحانات کے نتائج کا اعلان اگست ۲۰۰۴ میں کیا گیا۔ ان نتائج کے مطابق تمام طلبہ امتحانات میں کامیاب قرار دیے گئے۔ تمام مضامین میں طلبہ نے 82.13% نمبر حاصل کیے، جبکہ مختلف مضامین کے اعتبار سے طلبہ کی کارکردگی کا تناسب یہ رہا:

انگریزی 80%، اسلامیات 77.56%، مطالعۂ پاکستان 76%، اردو 91.67%، ریاضی 89.11%، ایڈمیتھ 91%، فزکس 82.11%، کیمسٹری 80.22%، بیالوجی 83%۔

اول پوزیشن حاصل کرنے والے طالب علم خضر رشید شیخ نے 90.75% نمبر حاصل کیے، جبکہ سب سے کم نمبر حاصل کر نے والے طالب علم کے نمبروں کا فی صد تناسب 69.88 رہا۔

یوں یہ نتائج ہر اعتبار سے بہت شان دار رہے۔ تمام طلبا و طالبات، ان کے والدین، اساتذہ اور اسکول انتظامیہ اس شان دار کارکردگی پر مبارک باد کی مستحق ہے۔ اور یہ توقع رکھنی چاہیے کہ اسکول کی انتظامیہ بچوں کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کے اس معیار کو برقرار رکھے گی تاکہ طلبہ اگلے مرحلے یعنی اے لیول میں اس سے بھی بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکیں۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ریحان احمد یوسفی

''تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیل نو''

مصنف: سیموئیل پی ہنٹنگٹن،

مترجم: سہیل انجم،

ضخامت: ۵۷۴ صفحات،

قیمت: ۳۲۵ روپے،

ناشر: آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۵ بنگلور ٹاؤن شارع فیصل، کراچی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دور جدید کی تاریخ کے دو مراحل گزر چکے ہیں۔ دور جدید کی تاریخ کا پہلا مرحلہ وہ تھا جب اقوام عالم قومی ریاستوں کی بنیاد پر تقسیم تھیں۔ اس دور میں مغرب کی طاقت ور اقوام نے کمزور ممالک اور ان کے وسائل پر قبضہ کر کے ان پر تسلط جما لیا۔ بعد میں جنگ عظیم اول اور دوم کے نتیجے میں سامراجی ممالک کی قوت ختم ہو گئی۔ نو آبادیاتی ریاستیں ایک ایک کر کے آزاد ہو گئیں۔ تاہم اس کے بعد اقوام عالم ایک نئی کشمکش کا شکار ہو گئیں۔ یہ کشمکش نظریاتی بنیادوں پر تھی جس میں جدید دنیا کے اہم اور طاقت ور ترین ممالک کمیونزم اور سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد پر، امریکہ اور سوویت یونین کے زیر سایہ، دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ یوں بیسویں صدی کا نصف آخر دو عظیم سپر پاورز کی باہمی چپقلش سے عبارت رہا۔ یہ وہ دور تھا جب بظاہر غیر جانب دار کہلائے جانے والے ممالک بھی کسی نہ کسی اعتبار سے دو سپر پاورز سے متعلق تھے۔ ان ممالک کی یہ کشمکش صرف نظریاتی بنیادوں تک محدود نہ تھی، بلکہ اس عرصے میں دنیا حقیقی معنوں میں ایٹمی جنگ کے خطرے سے دوچار رہی۔ دور جدید کی تاریخ کا یہ دور سوویت یونین کے خاتمے کے ساتھ تمام ہوا۔

کمیونزم کے زوال کے نتیجے میں سوویت یونین ختم ہوا تھا، دنیا نہیں۔ چنانچہ سرد جنگ کے فاتح اہل مغرب کے ذہنوں

میں یہ سوال پیدا ہونا شروع ہوا کہ اب دنیا کے معاملات کس اصول پر چلیں گے؟ اقوام عالم کی نئی صف بندی کن اساسات پر ہوگی؟ نیا عالمی نظام کن بنیادوں پر استوار ہوگا؟ ان سوالات کے نتیجے میں بہت سے جوابات سامنے آئے، مگر جس نقطۂ نظر نے دنیا بھر کے اہل علم ودانش کی توجہ حاصل کی وہ سیموئیل پی ہنٹنگٹن کے شہرۂ آفاق مضمون ''تہذیبوں کا تصادم'' میں پیش کیا گیا۔ یہ مضمون ۱۹۹۳ء میں 'فارن افیئرز' نامی جریدے میں شائع ہوا۔ بعد میں مصنف نے اسی عنوان سے ایک کتاب میں اپنے نقطۂ نظر کو تفصیلی دلائل کے ساتھ موید کر کے پیش کیا۔

اس کتاب کی اشاعت پر قریباً ایک عشرہ گزر چکا ہے اور اس دوران میں پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہ چکا ہے۔ خصوصاً ۱۱ستمبر کے واقعے کے بعد دنیا کی سیاست نے ایک خاص رخ اختیار کر لیا ہے، جس میں امریکہ اپنی بے پناہ طاقت کے بل بوتے پر جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ بین الاقوامی سیاست میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی سب سے بہتر تفہیم بلاشبہ اسی خاکے کی بنیاد پر کی جا سکتی ہے جو ''تہذیبوں کا تصادم'' میں پیش کیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک اس کتاب کے تراجم دنیا بھر میں ہو رہے ہیں اور کتاب کے قارئین کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ہمارے پیش نظر کتاب کا وہ ترجمہ ہے جو حال ہی میں آکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا ہے۔

یہ کتاب اپنے صفحات کے اعتبار سے تو بے حد ضخیم ہے، مگر مرکزی خیال کے اعتبار سے بہت مختصر۔ یعنی سرد جنگ کے بعد کی دنیا ثقافتی بنیادوں پر تقسیم ہوگی اور یہی تقسیم مستقبل کی جنگ وامن کے سلسلے میں فیصلہ کن ہوگی۔ مگر چونکہ یہ کتاب ایک خاص نقطۂ نظر کی تنقید میں لکھی گئی ہے، اس لیے اس میں اعداد وشمار، تحلیل وتجزیے، حالات وواقعات اور پس وپیش منظر وغیرہ کے بیان میں بڑی جزرسی اور تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔

یہ کتاب جس بنیادی نقطے کے اردگرد گھومتی ہے وہ مصنف کے اپنے الفاظ میں کچھ یوں ہے:

''اس کتاب کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ثقافت اور ثقافتی شناخت، جو وسیع ترین سطح پر تہذیبی شناخت ہوتی ہے، مابعد سرد جنگ دنیا میں اتحاد، انتشار اور تصادم کے تانے بانے بن رہی ہے۔'' (۲۰۔۲۱)

کتاب کے پانچ حصے ہیں جس میں مصنف نے اپنے اسی بنیادی مقدمے کو دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے اور اس کی بنیاد پر نئے عالمی نظام کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ پہلے حصے میں مصنف بتاتے ہیں کہ موجودہ عالمی سیاست کی بنیاد تہذیب ہے نہ کہ قوم یا نظریہ۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ دنیا اگر مغرب کے اثرات قبول کر رہی ہے تو یہ لوگوں کے جدید (Modern) ہونے کی علامت ہے نہ کہ مغربی (Westernize) ہونے کی۔ یہ اثرات کسی عالمی مغربی تہذیب کو پیدا نہیں کرتے، بلکہ مختلف تہذیبوں کے جدید ہونے کی علامت ہیں۔

دوسرے حصے میں مصنف بیان کرتے ہیں کہ مغرب کی طاقت زوال پزیر ہے۔ ایشیائی تہذیبیں اپنی بڑھتی ہوئی معاشی اور فوجی طاقت جبکہ مسلمان اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کی بنا پر مغرب کے لیے چیلنج پیدا کر دیں گے۔ تیسرے حصے میں مصنف

بتاتے ہیں کہ نیا عالمی نظام تہذیبی بنیادوں پر جنم لے رہا ہے اور لوگ تہذیب و ثقافت کی بنیاد پر ہی جڑ اور کٹ رہے ہیں۔ چوتھے حصے میں مصنف براہ راست تہذیبوں کے تصادم کو موضوع بنا کر یہ بتاتے ہیں کہ مغرب کا ٹکراؤ ممکنہ طور پر چین اور مسلم دنیا سے ہوگا۔ پانچویں اور آخری باب میں مصنف اہل مغرب کو یہ بتاتے ہیں کہ وہ اپنی مغربی شناخت پر قائم رہیں۔ اسی بنیاد پر امریکہ اور یورپ متحد ہو کر غیر مغربی معاشروں کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہوں۔

کتاب کا موضوع چونکہ بین الاقوامی سیاست اور عالمی نظام ہے، اس لیے دوسری اقوام اور تہذیبیں یقیناً زیر بحث آئی ہیں۔ اسی بنا پر کتاب دنیا بھر میں گفتگو، بحث و مباحثے اور تنقید و تجزیے کا موضوع بنی ہے۔ مگر درحقیقت یہ کتاب اہل مغرب کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہے اور سرد جنگ کے بعد پھیلنے والے بعض مغربی نظریات کو ہدف تنقید بنا کر اپنا استدلال پیش کرتی ہے۔ ان میں خاص طور پر وہ نقطۂ نظر سب سے نمایاں ہے جو سرد جنگ کے خاتمے اور کمیونزم کے خلاف مغرب کی کامیابی کے بعد مغربی حلقوں میں بڑا مقبول ہوا تھا۔ یعنی آزاد، جمہوری اور سرمایہ دارانہ مغربی معاشرہ انسانی فکری ارتقا کی آخری حد ہے۔ جس کے بعد دنیا پر واضح ہو چکا ہے کہ یہی اقدار مبنی برحق ہیں۔ دنیا انھیں قبول کر رہی ہے۔ اسے ایسا ہی کرنا چاہیے۔ اس عمل کے نتیجے میں ایک عالمی آفاقی تہذیب وجود میں آجائے گی جس کا امام مغرب ہوگا۔ اس نقطۂ نظر کی نمائندہ کتاب ۱۹۸۹ء میں شائع ہونے والی فرانسس فوکویاما کی کتاب 'The End of History' تھی۔

مصنف نے اس نقطۂ نظر کو رد کرتے ہوئے اہل مغرب پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرد جنگ کے بعد بین الاقوامی تصادم ختم نہیں ہوا، بلکہ اس کی اساسات بدل گئی ہیں۔ پہلے یہ تصادم قومی اور نظریاتی بنیادوں پر ہوتا تھا اور اب تہذیبی بنیادوں پر ہوگا۔ یہ سوچنا کہ جینز، برگر، پیپسی اور ہالی وڈ کا کلچر اختیار کرنے سے دنیا مغربی اقدار کو قبول کر رہی ہے، درست نہیں۔ دور جدید میں اہل مغرب کو کئی اعتبارات سے دوسری تہذیبوں پر برتری حاصل رہی ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انھوں نے دوسری تہذیبوں سے ترقی کے امکانات ختم کر دیے یا عروج و زوال کے فطری قانون سے اہل مغرب کو کوئی استثنا حاصل ہو گیا ہے۔ وہ مغرب کے آفاقی تہذیب کے تصور پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہر تہذیب خود کو دنیا کے مرکز کی حیثیت سے دیکھتی ہے اور اپنی تاریخ لکھتے وقت اسے انسانی تاریخ کے مرکزی ڈرامے کا مرتبہ دیتی ہے۔ یہ بات دوسری ثقافتوں کے مقابلے میں مغرب کے بارے میں شائد زیادہ صحیح ہے۔ لیکن ایک کثیر تہذیبی دنیا میں ایسے یک تہذیبی نقطۂ نظر کی اہمیت اور افادیت کم ہو رہی ہے۔'' (۶۳)

اس کے بعد مصنف بعض بڑے مغربی دانش وروں مثلاً اسپینگلر، ٹائن بی وغیرہ کے حوالے سے اس نقطۂ نظر پر تنقید کے بعد لکھتے ہیں:

> ''تاہم ان دانش وروں نے جن سرابوں اور تعصّبات سے ہوشیار رہنے کے لیے کہا تھا وہ زندہ ہیں اور بیسوی صدی کے آخر میں تنگ نظری پر مبنی اس متکبرانہ نقطۂ نگاہ کی صورت میں بہت عام ہو گئے ہیں کہ مغرب کی یورپی تہذیب اب دنیا کی آفاقی

تہذیب ہے۔"(۶۴)

کتاب کی ابتدا میں اس تصور پر تنقید کرنے کے بعد پوری کتاب میں مصنف نے وہ حالات و واقعات، اعداد و شمار اور حقائق بیان کیے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ:

آج کی دنیا ایک کثیر تہذیبی دنیا ہے۔

اس دنیا میں مغربی تہذیب کی طاقت ماضی کے مقابلے میں بہت کم ہو چکی ہے۔

دیگر تہذیبیں نہ صرف موجود ہیں اور اپنے وجود کا اثبات کر رہی ہیں، بلکہ طاقت کا توازن بتدریج ان کے حق میں بدلتا جا رہا ہے۔

دنیا میں دوستی، دشمنی اور امن و جنگ کے سارے معاملات تہذیبی بنیادہی پر ہوں گے۔

مغرب کے لیے سب سے بڑا ممکنہ چیلنج چینی اور مسلم تہذیب کی طرف سے رونما ہوگا۔

اس نئی تہذیبی دنیا کا اثبات کیے بغیر مغرب دنیا پر اپنی برتری برقرار نہیں رکھ سکتا اور نئے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ امریکہ اور یورپ کا اتحاد وجود میں آئے۔

مصنف نے جس نقطۂ نظر کو اس کتاب میں پیش کیا ہے، محسوس ہوتا ہے کہ امریکی پالیسی سازوں نے اس نقطۂ نظر کے بہت سے پہلوؤں کی افادیت کو تسلیم کر لیا ہے۔ خاص طور پر ۱۱ ستمبر کے واقعے کے بعد۔ چنانچہ پہلے مرحلے پر مسلم تہذیب کے کمزور چیلنج کو کچلنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں افغانستان اور عراق کا حشر دیکھنے کے بعد ایران اور لیبیا اپنے نیوکلیائی پروگرام سے دست بردار ہو گئے۔ تاہم جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری بڑی حد تک خود مسلم رہنماؤں پر عائد ہوتی ہے۔ کتاب میں مختلف تہذیبوں کی طاقت کا جو حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا گیا ہے، اس کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مغرب کے لیے اصل خطرہ چین کی ابھرتی ہوئی فوجی اور معاشی طاقت ہے، مگر اس کے باوجود چینی رہنما حتی الامکان مغرب کے مقابلے میں آنے سے گریز کرتے ہیں۔ جبکہ ہماری صورت حال یہ ہے کہ جذباتی لیڈر شپ کا بس نہیں چلتا کہ پورے عالم اسلام کو امریکہ سے بھڑا دیں۔ زمینی حقائق کیا ہیں؟ اللہ تعالیٰ کے کن قوانین کے تحت یہ دنیا چل رہی ہے؟ تاریخ کا سبق کیا ہے؟ عوام الناس کے حالات اور ان کی ذہنی کیفیت کیا ہے؟ ان تمام چیزیوں سے جذباتی لوگوں کو کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کے فکر و فہم کا آخری منتہا یہ ہے کہ امریکہ (مغرب) کا زوال عنقریب ہو جائے گا۔ تاریخ سے معمولی شد بد رکھنے والا شخص بھی یہ جانتا ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کا اس کی جگہ لینے کا کوئی امکان ہے؟ بدقسمتی سے اس سوال کا جواب نفی میں ہے اور یہ وہ بات ہے جس کی طرف ان لوگوں کی کوئی توجہ نہیں۔

مسلمانوں کے لیے سب سے بہتر راستہ یہی ہے کہ فوراً سے پیش تر فوجی میدان میں خود کو مغرب کے مقابلے سے ہٹا دیں۔ اس کے بجائے وہ اس تہذیبی جنگ کی تیاری کریں جس سے مصنف نے بڑا صرف نظر کیا ہے۔ یعنی حیات و کائنات

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کے بارے میں دنیا بھر کا مغربی نقطۂ نظر کو اختیار کر لینا۔ مصنف چونکہ اصلاً ایک سیاسی دانش ور ہیں، اس لیے انھوں نے چیزوں کو اسی عینک سے دیکھا ہے۔ وگرنہ یہ ایک حقیقت ہے کہ الحاد پر مبنی اہل مغرب کی تہذیب دنیا کے خشک وتر اور مشرق ومغرب پر حکمران ہے۔ اور اس اعتبار سے بلاشبہ یہ ایک عالمی تہذیب ہے۔ مسلمانوں کو اصل خطرہ مغرب کی فوجی یا معاشی طاقت سے نہیں، بلکہ ان کی تہذیبی یلغار سے ہے۔ اس یلغار کے وہ پہلو جو مسلمانوں کو توحید و آخرت سے غافل اور عفت وعصمت سے بے نیاز کر رہے ہیں، تہذیبوں کے تصادم کا، مسلمانوں کی حد تک، اصل میدان ہیں۔

مصنف کے تجزیے کا ایک اور کمزور پہلو اس حقیقت کو نظر انداز کرنا ہے کہ مفادات صرف تہذیبی نہیں ہوا کرتے۔ معاشی، سیاسی اور دیگر کئی طرح کے مفادات ہیں جو دور جدید میں قوموں کی صف بندی میں نمایاں کردار ادا کریں گے اور کر رہے ہیں۔ افغانستان پر حملے کے وقت پاکستان نے جو کچھ کیا، وہ اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ اسی طرح اسلام کی اصل تعلیمات سے بے خبری کی بنا پر مصنف یہ نہ جان سکے کہ وہ بہت سی اقدار جو مغرب نے دنیا میں رائج کی ہیں، اسلام ہی نے پہلی دفعہ دنیا کے سامنے ان کا عملی نمونہ پیش کیا تھا۔ انسانی حقوق، جمہوریت، خواتین کے حقوق، اظہار رائے کی آزادی اور ان جیسی بہت سی دیگر اقدار ہیں، اسلام جن کا سب سے بڑا مبلغ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مسلمان بعد میں ان اقدار کو گنوا بیٹھے اور اب ان کے مخالف ہو گئے ہیں۔ جس روز وہ حقیقی اسلام کے علم بردار بنے، سب سے بڑھ کر ان اقدار کو دنیا کے سامنے لے کر اٹھیں گے۔

بہر حال یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر باشعور شخص اس کا مطالعہ کرے۔ اس سے نہ صرف اہل مغرب کے ذہن کا اندازہ ہوتا ہے، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقائق کا تجزیہ کس انداز سے کرتے ہیں۔ ایک حدیث میں مومن کو ''اپنے زمانے سے باخبر'' قرار دیا گیا ہے۔ کتاب کے قاری کو اندازہ ہوگا کہ یہ صفت جو آج کے مسلمانوں میں تو شاید موجود نہیں، ہم جنھیں ''کافر'' قرار دیتے ہیں، ان میں بافراط پائی جاتی ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org